پندرہ روزہ دہلی

چنگاری

حسن نعیم کی غزلیں ایک چوتھائی صدی سے ندرت، معنویت اور موسیقی کا دلکش سنگم رہی ہیں۔ ادھر پانچ سات برسوں سے ان میں ایک مزید جہت دردمندی کی نمایاں ہو گئی ہے جس نے ان کے مدّاحوں میں دانشوروں کے علاوہ غزل کے عام پرستاروں کو بھی شامل کر لیا ہے۔ شائد یہی وجہ ہے کہ اب ان کی غزل کو سرحد پار بھی نگاہِ اعتراف سے دیکھا جا رہا ہے اور انھیں ہمارا نمائندہ ترین شاعر کہا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں افسانہ نگار اور ادبی مبصّر منیر احمد شیخ (سابق پاکستانی پریس کانسلر) کے حوالے سے معروف شاعر اور کالم نگار عطاء الحق قاسمی نے نوائے وقت لاہور (۳۱ر اگست ۸۲ء) میں لکھا ہے: "منیر احمد شیخ کی رائے میں ہماری شاعری اور ان کی (ہندستان کی) علاقائی فکشن پاور فل ہے۔ البتہ وہاں انھیں شاعری میں حسن نعیم اچھا لگا مگر انھوں نے اپنی غزلوں کو ہندی میں چھپوایا ہے۔" آخری جملے میں مگر کا استعمال گمراہ کن ہے۔ شائد منیر احمد شیخ اور قاسمی صاحب کو خبر نہیں کہ ۷۱ء میں اشعار اردو خط میں چھپا تھا اور تیس برسوں کا انتخاب "دبستان" بھی اردو میں ہی چھپ رہا ہے، حرف غزل نامہ جو نئی اور پرانی غزلوں کا انتخاب ہے ۱۹۸۰ء میں دیوناگری خط میں چھپا تھا۔

غزل

وہ جو درد تھا ترے عشق کا وہی حرف حرف سخن میں ہے
وہی قطرہ قطرہ لہو بنا وہی ریزہ ریزہ بدن میں ہے

دمِ صبح آج ہے دوپہر نہ وہ چہچہے نہ وہ زمزمے
وہ پرندے اڑ کے کہاں گئے کوئی شور گاؤں نہ بن میں ہے

یہی وقت سیلِ رواں لئے مری کشتیوں کو ڈبو گیا
کوئی لہر آبِ حیات کی ابھی گنگ میں نہ جمن میں ہے

وہ نسیم جانے کدھر گئی وہ گلاب جانے کہاں گئے
کوئی آگ پچھلی بہار کی مرے قلب میں نہ چمن میں ہے

جو ستارا قبلہ راہ تھا، وہ شرار بن کے بجھا نعیم
یہ زمین چادرِ خاک ہے مرا چاند جب سے گہن میں ہے

حسن نعیم

پندرہ روزہ

چنگاری دہلی

ایڈیٹر
جمیلہ احمد

ادبی حصّے کی ترتیب
بشیر احمد
انیس احمد خاں

شمارہ نمبر ——— ۱۷

قیمت:
۲ روپے۔ سالانہ ۴۵ روپے

پتہ
۳/۱۴۱۰ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲

جمیلہ احمد ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے اعلیٰ پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر ۳/۱۴۱۰ رام نگر شاہدرہ دہلی سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

گوشہ بیروت۔
فلسطینی انقلاب کا چہرہ۔
یہودی ریاست۔
جہاں ہم ہیں۔
خانہ بدوش۔
محبت اور بیٹر ولیم۔
فیض سے ملاقات۔
حسن نعیم۔
دھواں۔
دو آوازیں۔
وشوامتر۔
میری شاعری کی عورت۔
ضیا فتح آبادی، ظہیر غازی پوری۔
انیس جلالی
جاوید، افتخار امام، احمد سوز،
جعفر شیرازی، عشرت صدیقی

آپ کا خط مِلا

' بیدی نمبر ' بہت اچھا شائع ہوا ہے اس کے بارے میں شاید ہی دو رائیں ہوں۔ ۶۰۰ صفحات کا چھاپ دیتے تو کم سے کم ہندوستان میں تو ریکارڈ قائم ہو جاتا۔ پاکستان میں تو فیض احمد فیض ندیم قاسمی اور دوسرے ادیبوں پر اتنے ضخیم نمبر نکلے ہیں لیکن ہندوستان میں ایسا نمبر میرے دیکھنے میں نہیں آیا۔ بیدی مصیبت میں بھی ہیں۔ انھیں ضرور کچھ راحت ملی ہوگی۔ اور وہ خوش ہوئے ہوں گے۔

میں آجکل اپنے ضخیم ناول " گرتی دیواریں " کا آخری حصہ لکھ رہا ہوں۔ دو ہزار صفحات لکھنا ہیں اور ابھی بہ مشکل تمام ۱۲۵ صفحات لکھے ہیں۔ جن کے بارے میں لگتا ہے کہ ایک بار اور لکھنے پڑیں گے اور میری عمر ۷۰ کی ہو گئی ہے ایسی میں کوئی بڑی چیز " چنگاری " کے لیے بھیجنا مشکل ہے ہاں غزلیں چاہیئں اور تین چار اکٹھی شائع کر سکیں تو بھیج دوں۔ طبیعت اگر کچھ سنبھل گئی تو کوئی ایک یک بابی ڈرامہ بھیج سکتا ہوں۔

اپندر ناتھ اشک

• • •

" چنگاری " مواد کے لحاظ سے کئی جرائد سے غنیمت ہے۔ کیا ہی بہتر ہو اگر آپ اس کی ظاہری شکل اور صوری حیثیت پر بھی توجہ مبذول فرمائیں۔ کئی تحریریں صرف طباعت و کتابت کی خامیوں کی وجہ سے پڑھنے میں دشواری ہوئی

خدا کرے آپ اپنے نیک مقاصد میں کامیاب ہوں۔

انجم عثمانی

• • •

حسب فرمائش ایک مزاحیہ نظم ارسال ہے۔ پسند خاطر ہو تو ' چنگاری ' کے کسی شمارے میں شامل کر لیں ویسے پچھلے کئی شمارے نظر سے گذرے ہیں بے حد پسند آئے۔ اب تو یہاں کے کئی بک سٹال میں یہ رسالہ نظر نہیں آتا۔ مجتبیٰ حسین صاحب کا سفر نامہ " جاپان چلو جاپان چلو " چنگاری کے پہلے دو شماروں میں شائع ہوا۔ پھر پتہ نہیں کیا بات ہوئی کہ بعد کی قسطیں نہیں چھپیں۔

اسمٰعیل آزر

• • •

" چنگاری " کا سرورق دلکش ہے اور مواد معیاری ہے۔ پسند آیا۔ آپ کا خط ملا کے تحت شائع ہونے والے خطوط جاندار ہیں

ضیا جبلپوری

• • •

بہت ہی اہم شمارہ ہے۔ خاص کر خدیجہ مستور اور غلام عباس سے متعلق تحریریں جو کہ اب اس دنیا میں نہیں رہے، بہت ہی اہم اور کار آمد ہے۔ صنعتی تہذیب کے عنوان سے کے کے کھلر صاحب کی تحریر حقیقت پر مبنی اور دلچسپ ہے دعوت فکر دیتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اچھے رسالے بہت دیر میں اور بہت کم نکلتے ہیں۔ لیکن وہ ختم بہت جلد ہو جاتے ہیں " عصری آگہی " نے جو مقام تھوڑے سے وقفے میں بنایا تھا اس سے اردو دنیا اچھی طرح سے واقف ہے مقبولیت کی اس منزل تک پہونچانے میں آپ لوگوں کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ اس کا اندازہ ہم پڑھنے والے ہرگز نہیں لگا سکتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عصری آگہی کا نام اب " چنگاری ہو گیا ہے۔ بس۔ انشاء اللہ جلد ہی یہ ایک مقبول عام رسالہ ہوگا۔

اس سے پہلے عصری آگہی کے بیدی نمبر سے متعلق اطلاع ملی تھی ہم لوگ اسے منگانے والے تھے کہ آپ نے استاد محترم پروفیسر سید محمد عقیل صاحب کے پتہ پر اس کی کچھ کاپیاں ارسال کر دیں وہ ہم لوگوں نے لے لی ہیں۔ یہ نمبر بیدی سے متعلق ایک دستاویز ہے جس کے لیے ہم تمام دوستوں کی طرف سے آپ کو بہت بہت مبارک باد۔ چنگاری کا سالانہ چندہ میں جلد ہی بھیج دوں گا۔ میری خواہش ہے کہ آپ اس رسالہ کی تقریباً ۵ کاپیاں ارسال کر دیں۔ کیونکہ ہمارے ساتھ کئی ایسے ریسرچ اسکالر ہیں جو کہ اس کو خریدنا چاہتے ہیں وہ ہم انھیں دے دیں گے اور آپ کو پیسے منی آرڈر کر دیں گے یا آپ وی پی بھیج دیں، جیسا سمجھیں۔ اگر آپ میرے پتہ پر نہ بھیج سکیں تو ڈاکٹر عقیل صاحب کے پتہ پر بھی بھیج سکتے ہیں وہاں سے ہم لوگوں کو مل جائے گا۔

محمد اشتیاق

• • •

آداب و نیاز !

آپ کی بھیجی ہوئی کتاب ایک بار پڑھ چکا ہوں۔ افسوس کا مقام ہے کہ کے کے کھلر بیدی کے شاہکار " حجام الہ آباد کے " کو قبول نہیں کر سکے۔ کہتے ہیں کہ جب الہ آباد کے حجاموں کی باری آئی۔ تو بیدی کے قلم کی سیاہی پھیکی پڑ گئی۔ میرا عقیدہ ہے کہ جس شخص نے کبھی شیو نہ بنوائی ہو۔ شیو کے لچھن نہیں سمجھ سکتا۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ اس مضمون کو تحریر کرنے سے پہلے بیدی صاحب کو شیو بنوانی چاہیے تھی۔ پھر کہتے ہیں " لوک پتی کا استرا بیدی کی گرفت میں نہیں آیا ... دلیپ کمار کا نائی کرشن چندر کی پکڑ میں نہیں آیا اور لوک پتی بھی کوئی چھوٹا موٹا نائی نہیں ہے۔ جو بغیر بیدی کی شیو کیے ہوئے اس کی زد میں آجائے .... بیدی کو آنے والے جنم پر اعتقاد نہیں۔ اسی لیے وہ اپنے دکھ اسی جنم میں بانٹ رہا ہے۔" آنے والے جنم پر بھروسہ ہونا ہمارے موجودہ دکھوں کا دارو نہیں۔ پھر اسلوب احمد انصاری کا حوالہ دیکر کہتے ہیں کہ " بیدی کو زبان اور محاورے پر عبور حاصل نہیں ہے .... زبان

کی خوبی کا بہر حال ایک معیار ہوتا ہے۔ جسے اہل زبان ہی متعین کر سکتے ہیں۔" اتنا کہہ کر خود ہی کہہ دیتے ہیں کہ اسلوب احمد کے سارے کے سارے بیدی والے اعتراضات پریم چند پر بھی پورے اترتے ہیں۔

پھر فرماتے ہیں "حملہ آور ہر چیز کی تاب لا سکتا ہے۔ لیکن شیو کے شیشے کی نہیں لوک پتی تو شیشے کے بغیر ہی گاہک سے گناہوں کا اعتراف کروا رہا ہے۔ اگر کہیں لوک پتی کے پاس شیو کا شیشہ ہوتا۔ تو راجندر سنگھ بیدی کو ضرور دکھاتا۔ لوک پتی ان لوگوں میں سے ہے۔ جو ایک فرد یا حجام سے کچھ زیادہ ہوتے ہیں" نہ جانے شیو کے شیشے سے کھلر صاحب کی کیا مراد ہے۔ لوک پتی ایک فرد یا حجام سے زیادہ کیسے ہو سکتا ہے؟ پھر سنئے "حقیقت یہ ہے کہ جب بیدی کا تخیل سنگم کے نائیوں سے ٹکرایا تو سرسوتی ندی کو ڈھونڈنے والا لوک پتی اپنے خالق کی وہ خبر لیتا ہے جو اس الہ آباد کے حجام نے بیدی کی لی۔ ببوا کہہ کے اس کے آدھے گال پر خط بنا کے اور اس کے بعد اس نے اس کی ایسی بیاری شیو بنائی کہ سات جنم تک اس کی تھوڑی پر بال نہیں اُگ سکتے" معلوم نہیں لوک پتی اپنے خالق یا خدا کی خبر کیسے لے سکتا ہے؟ سات جنم تک بیدی کی تھوڑی پر کس لیے بال نہیں اُگ سکتے؟ آگے کہتے ہیں "کوشک کو بیدی پنجاب کا حجام بتاتے ہیں جو الہ آباد کے حجاموں میں آگھسا ۔۔۔ پنجاب میں نائیوں کو راجہ کہتے ہیں اور بیدی راجہ مہدی علی خاں کے سوائے کسی راجے سے شاید نہیں ملے۔ بیدی کی ڈاکخانے کی ملازمت نے اردو ادب کو ایک پنشن یافتہ پوسٹ ماسٹر کا کردار دیا۔ حجام کا کردار دینے کے لیے حجاموں کی محبت اشد ضروری ہے۔" پنجاب میں نائی کو راجہ تو کہا جاتا ہے لیکن یہ حقیقی راجہ یا وزیر تو نہیں ہو سکتا۔ حجام کا کردار بیدی کا کردار نہیں۔ بیدی کے حریف یا مدِ مقابل کا ہے۔

آگے کہا ہے "آرٹسٹ اور لوہار ایک صف میں بیٹھ سکتے ہیں۔ افسانہ نویس اور حجام نہیں۔۔۔۔ اس کہانی میں بیدی کی تحریر اور طرز تحریر خشک ہے۔ الفاظ روکھے پھیکے اور جملے جوش سے خالی ہیں۔ ہمیں انشا پردازی کی نفاستوں کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اس انداز اور تحریر کا اثر بیدی کے کرداروں پر کچھ اس طرح پڑا کہ لوک پتی کے ہاتھ میں استرے کی بجائے اگر تلوار بھی ہوتی تو ڈھنگ سے لڑ نہیں سکتا تھا کچھ آدمیوں کی آدھی شیو تو لوک پتی نے رو دھو کے کر دی۔ باقی جو کیو میں کھڑے ہیں۔ ان کی شیو کون کرے گا؟ آرٹسٹ اور لوہار ایک صف میں کیسے بیٹھ سکتے ہیں؟ کھلر صاحب کی تحریر سے رقابت کی بو آتی ہے۔ جو بیکار ہے۔ آپ یک طرفہ فیصلہ صادر کر دیتے ہیں۔ بیدی یہی تو کہنا چاہتا ہے کہ کیو میں کھڑے لوگوں کی شیو ہوگی ہی نہیں۔ شیو صرف ایک رخسار کی کی جاتی ہے۔ اتنے میں دوسرے رخسار پر بال اُگ آتے ہیں۔ یعنی چہرے کے دونوں اطراف کی شیو کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔

آگے سنئے "میرے خیال میں بیدی صرف عورتوں کا کاریگر ہے۔ خاص کر جو تیسرے پیٹ سے ہوں۔ بیدی کی عورت اپنے آپ کو عورت منوانا چاہتی ہے۔ دیوی نہیں۔ اس کو کپڑے کی گیند کی طرح استعمال کیجئے۔ وہ کچھ نہیں کہے گی۔ لیکن جونہی آپ نے اسے مورتی بنایا یا وہ باغی ہوئی" بیدی عورت کو دیوی بنانا کب چاہتا ہے؟

آخر میں کہتے ہیں "بیدی کو نہا رہی عورت کو بیان کرنے میں بھی بڑا مزہ آتا ہے خاص کر وہ جو ساڑھی سمیت نہا رہی ہو۔۔۔ وِدیا جو افسانے میں بیدی کی بیوی کا رول ادا کرتی ہے۔ ایک ایسی ہی عورت ہے۔ جو ساری زندگی کھل کر نہیں نہائی" عجیب بات ہے کہ کھلر صاحب عورت کا نام آتے ہی آپے سے باہر کیوں ہو جاتے ہیں؟ ان میں قوت برداشت کی کمی ہے۔ کھل کر نہ نہانے کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستانی عورت میں جنس کے لحاظ سے گرہیں یا رکاوٹیں ہیں۔ وہ غیر مرد سے بات تک کرتی ہوئی گھبراتی ہیں۔ اس سے ہاتھ ملانا تو کجا؟ ہماری بوڑھی عورتیں تک بھی غیر مرد کے سامنے نہیں آتیں۔ مرد ایک عورت سے جنسی طور پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ بڑا سوال تو یہ ہے کہ ہمارا گرہستی جیون ناخوشگوار کیوں ہے؟

بیدی کا یہ کہنا کہ "طبیعت اس قدر حاضر ہے کہ اپسرا کی بجائے دیو بالک پسند کرتا ہے۔ جانتا ہے نا کہ عورت سے پیار تو ایک قدرتی بات ہے لیکن مرد سے پیار سروا اُچ کارا" ظاہر کرتا ہے کہ بیدی میں کسی قسم کی نہیں۔ نفسیات کی رو سے مرد کو عورت سے بے اعتنائی بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی وجہ کوئی المیہ ہو سکتا ہے یا ہمارا سماجی ماحول۔ جس میں انسان پر بندشیں عاید

ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن کا کہنا صحیح ہے کہ بیدی کے کرداروں میں کامیاب کردار بہت سے ہیں لیکن ابھی تک ان کے قلم نے کوئی امراؤ جان کوئی لیلیٰ پیدا نہیں کی ہے۔ یعنی ان کے قلم نے ابھی تک کوئی گائیکہ (مثلاً لتا منگیشکر) کوئی افسانہ نگار خاتون (مثلاً واجدہ تبسم بمبئی) یا شاعرہ (مثلاً نسیم نکہت لکھنؤ) پیدا نہیں کی ہے۔

ایک فلم ساز عورت کے بیرونی حسن میں الجھا رہتا ہے۔ اندرونی حسن کو دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ واجدہ تبسم کی کتاب "نتھ اتر آئی" میں اسی عنوان سے ایک افسانہ ہے۔ ایک طوائف کی لڑکی چمن آرا کا تعلق ایک نوجوان نواب زادہ سے ہو جاتا ہے۔ مگر نتھ اتر آئی کی رسم اس کا جاگیردار والد ادا کرتا ہے۔ لکھتی ہیں:۔

چمن نے اسے (نوجوان نواب زادہ کو) دیکھا اور پاگلوں کے سے انداز سے چلا چلا کر ہنسنے لگی۔ "امی جان! ذرا ایک رشتہ مجھے سمجھا دو — یہ بچہ جو میرے پیٹ میں ہے میرا بیٹا بھی ہو سکتا ہے اور شاید میرا پوتا بھی۔ ہے نا امی جان۔ ہو سکتا ہے اور بھی کئی رشتے رشتوں سے نکل آئیں تو میں امی جان —— میں خود اپنی بہو بھی ہوئی اور اپنی ساس بھی۔ کیونکہ امی جان آپ کی عنایت کی وجہ سے باپ بیٹے ایک ہی تھالی میں کھا گئے ہیں۔۔۔ امی جان ذرا رشتہ تو سمجھ لیجئے پھر مجھے سمجھا۔۔۔۔" اور ایک دم وہ چیختے چیختے بے ہوش ہو گئی۔

نسیم نکہت کا ایک شعر ہے ؎

میں زمانے میں ترے نام سے مشہور ہوئی
تجھ سے پہلے تو میرے نام کی شہرت ہی نہ تھی

ڈاکٹر محمد حسن کا کہنا ہے کہ "یہ عام انسانی ذہن نہ جنسیات کے لیے وقف ہے نہ سیاست کے لیے۔ دونوں زندگی کے اہم جزو ہی مگر صرف جز ہی تو ہیں۔ ان سے اعلا افضل اور برتر تو خود زندگی ہے۔ اس کے برعکس میرے خیال میں جنس انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ کسی سے دوسری قسم کا لگاؤ جو جذباتی نہ ہو۔ عارضی تو ہو سکتا ہے دیرپا نہیں ہو سکتا کیونکہ اس قسم کے تعلقات کا دارومدار مالی نفع یا نقصان پر ہوتا ہے۔ بے غرض قربانی کا تصور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ہم سیاست کو بھی زندگی سے بالکل خارج نہیں کر سکتے۔

گرچرن سنگھ گوہر

• • •

"عصری آگہی" کے کئی شمارے میرے نظروں سے گزرے تھے۔ اس گروپ سے چنگاری کا اجرا ایک خوش آئند بات ہے۔

محمد طارق کی منی کہانی "گدھ" بہت پسند آئی۔ میں اس کا ہندی ترجمہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ براہ کرم ان کا پتہ عنایت فرمائیں۔ تاکہ میں ان کو اجازت نامہ کے لئے خط لکھ سکوں۔

نیک خواہشات کے ساتھ
جاوید

ہمارے ادارے کی چار زیر طبع

مطبوعات

۱۔ کالم نگار نمبر۔ فکر تونسوی

۲۔ عالم اسلام۔ اصغر علی انجینیر

۳۔ صبح کتنی خوبصورت ہے۔ (پنجابی افسانے) جی، ایس، بھلر

۴۔ آسمانی خطوط۔ ڈاکٹر محمد یعقوب عامر

چنگاری ۳۵۸/۷

گوشۂ بیروت

ایک تجزیہ:

فلسطینی انقلاب کا نیا چہرہ

عبداللہ ملک

یہ ۱۹۷۹ء کا سال اور اپریل کا مہینہ تھا جب بیروت میں فلسطینی آرٹسٹوں کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی تھی؛ اس وقت ابھی بیروت کا حُسن باقی تھا. گو مسلسل خانہ جنگی نے اس کے حسن کو گدلا دیا تھا، اور خوف اور وحشت کی لکیریں ابھرنی شروع ہو گئی تھیں. خوف کی ان لکیروں نے بیروت کی حسیناؤں کے چہروں کو بھی متاثر کیا تھا. لیکن ایسی فضا میں بھی فلسطینی مجاہدین آزادی سینہ تان کر چل رہے تھے. اور وہ اس دور میں بھی عزم و ہمت کا پیکر دکھائی دیتے تھے، یہ عزم و ہمت ہی تھی کہ وہ اس فضا میں آرٹ اور ادب، مصوری اور موسیقی کی باتیں کر رہے تھے اور ... مقصد کے لیے فلسطینی آرٹسٹوں کی کانفرنس طلب ہوئی تھی ... سوچا جا سکے کہ فلسطینی جنگ آزادی میں آرٹسٹ کیا رول ادا کر سکتے ہیں؟ وہ اس عظیم جنگ کو فتح ... ہم کنار کرنے کے لیے اپنے رنگوں اور برشوں کو کیسے استعمال میں لا سکتے ہیں؟ اس موقع پر کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے فلسطین کی تنظیم آزادی کے صدر اور فلسطینی عوام کے مسلمہ قائد یاسر عرفات نے کہا تھا۔

"آرٹ فلسطینی انقلاب کا ایک عظیم ہتھیار ہے مصور کا برش، ڈاکٹر کے سرجری اوزار اور مزدوروں کا تیشہ یہ سب فلسطینی انقلاب کی ایک مکمل تصویر کے مختلف پہلو ہیں"

اس کانفرنس میں یہ سوال نہیں اٹھایا گیا تھا کہ آیا ادیب، دانشور، موسیقار اور مصور کو انقلاب میں حصہ لینا چاہیے یا نہیں؟ چونکہ یہ سوال تو مدتیں ہوئیں حل ہو چکا تھا اور پچھلے دو ماہ سے بیروت کے گلی کوچے جس طرح سے فلسطین کے مجاہدین آزادی کے خون سے لالہ زار بنے ہوئے ہیں اس خون نے پورے عالم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے. اور اب یہ مسئلہ صرف ادیب اور دانشوں کے حساس دل و دماغ کو ہی پریشان نہیں کر رہا بلکہ اس روئے زمین پر بسنے والا ہر ذی نفس اس معرکۂ حق و باطل سے متاثر ہو رہا ہے

ایک زمانے میں یہ تصور تھا کہ ہر صدی ایک مجدد پیدا کرتی ہے جو انسانیت کو آگے لے جانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے. اور اس کی رہنمائی کرتا ہے. لیکن اب انسانوں کو آزادی کی تحریکیں اور سماجی تبدیلیوں کے انقلاب متاثر کرتے ہیں اور یہی انقلاب اور یہی تحریکیں ان کی رہنمائی کرتی ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اب مجددوں اور رہنماؤں کے لیے صدی کا انتظار نہیں کرنا پڑتا. بلکہ اب یہ وقفہ دہائیوں سے بھی کم ہوتا جا رہا ہے" اس صدی میں انسان کتنے انقلابوں اور کتنی تحریکوں سے متاثر ہوا ہے. ان تحریکوں نے عالمی علم و ادب کو کتنا متاثر کیا ہے کہ باقاعدہ عالمی سطح پر مزاحمتی ادب کا ایک الگ سے شعبہ قائم ہو گیا ہے" ان مزاحمتی تحریکوں نے بہترین عالموں ادیبوں مصوروں سائنسدانوں کو متاثر کیا، پہلی ربع صدی میں جب پہلی جنگ عظیم کی ہولناکیوں میں سے سوویت یونین کے انقلاب نے جنم لیا تھا تو یہ ٹھہرے ہوئے پانیوں میں پہلا پتھر تھا جس نے نئے طوفانوں کے پٹ کھول دیے اور دیکھتے دیکھتے سامراج دشمن تحریک ایک مسلمہ تحریک کے طور پر ابھری اور یورپ اور ایشیا میں زبردست سامراج دشمن تحریکوں کو جنم دیا۔ اور پھر جب ان تحریکوں کو کچلنے کے لیے سامراج نے فسطائیت کا سہارا لیا تو پھر فسطائیت کے خلاف عظیم تحریکیں ابھریں، یورپ اور ایشیا کے ادیبوں نے فسطائیت کے خلاف کانفرنسوں کا سلسلہ شروع کیا میکسم گورکی، رومن رولاں، ٹامس مان، آندرے ژیدر، الف فاکس، ڈیوڈ گیسٹ، سجاد ظہیر، کو جو غرضیکہ دیس دیس سے ادیب اسپین میں اکٹھے ہوئے اور انہوں نے دنیا بھر کے دانشوروں اور اہل علم کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ فیصلے کا وقت آ گیا ہے" علم و امن کا دشمن سر پر کھڑا ہے اس لیے جلدی کرو. وقت ضائع کیے بغیر میدان کارزار میں کود پڑو چنانچہ ۱۹۳۶ء میں جب اسپین میں جمہوری حکومت کے خلاف فسطائیوں نے فرانکوں کی قیادت میں بغاوت کی اور وہاں خانہ جنگی کی ابتدا ہوئی تو یہ فاشزم کے خلاف پہلا مورچہ تھا. ایک طرف فرانکو اور پورے یورپ کے فاشسٹ ہٹلر اور مسولینی کی قیادت میں اس بغاوت کی حمایت کر رہے تھے، ساتھ ہی تمام سامراجی بھی کھلے بندوں جمہوری حکومت کے خلاف صف آرا ہو رہے تھے. تو دنیا بھر کے آزادی پسندوں نے بھی اسپین کی جمہوری حکومت کو بچانے اور فسطائیوں کے حملوں کو روکنے کے لیے اپنی کمر کس لی تھی یہ پہلا معرکہ تھا جس میں دنیا کے دانشوروں نے باقاعدہ ایک انٹرنیشنل بریگیڈ قائم کیا تھا. اور اور اس میں دیس دیس سے دانشور اور اہل علم لڑنے کے لیے پہنچے تھے. اس میں امریکہ کے ادیب تھے، یورپ کے ملکوں سے ادیب اور دانشور تھے اور اسی انٹرنیشنل بریگیڈ میں شریک ادیبوں اور دانشوروں کو مخاطب کر کے رائیفل البرٹی نے کہا تھا۔

تم دور دراز سے آئے ہو
لیکن تمہیں ان فاصلوں کی کیا فکر
یہ خون سرحدوں سے بے نیاز ہے، لیکن وہ
پھر بھی گائے جا رہا ہے
تم کسی دن کسی رات، کسی لمحے
موت سے ہم آغوش ہو جاؤ گے۔
لیکن کون جانتا ہے کہ یہ موت تمہیں کہاں
آئے گی۔
کس شہر میں، کس قصبے میں کس گاؤں میں
کس کھیت اور کس سڑک کے کنارے
یہ بھی کون جانے کہ یہ کونسا ملک ہوگا۔
چھوٹا یا بڑا۔ وسیع یا مختصر
لیکن حقیقت صرف اتنی ہے کہ تم یہاں آئے ہو
ایک ایسے ملک میں جسے تم نہیں جانتے
اب جس زمین میں تم دفن ہو۔
جس مٹی میں تم پنہا ہو۔
تم اس مٹی سے محبت کرتے تھے۔

پھر جب ہٹلر نے جنگ کا آغاز کیا اور یورپ کو روندتا ہوا ماسکو کے دروازوں تک پہنچ گیا تو پورے یورپ اور سارے عالم میں فسطائیت کے خلاف مزاحمتی تحریکیں اٹھنے لگیں

اور دیکھتے دیکھتے بہترین انسانوں نے اپنے برش اور قلم چھوڑ کر مزاحمتی تحریکوں میں شرکت اختیار کرنی شروع کر دی۔

اب ان تمام واقعات کو ربع صدی سے زیادہ عرصہ گذرنے لگا ہے ایک پود جس نے ان واقعات کو قریب سے دیکھا تھا یا ان ہنگاموں میں شریک ہوئی وہ بوڑھی ہونے لگی ہے لیکن ویتنام کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا یہ بھی اپنی قسم کا پہلا معرکہ تھا جس میں امریکی سامراج کو بالا آخر شکست اور ہزیمت اٹھانی پڑی۔

اور اب فلسطین کی تحریک آزادی نے جس مزاحمتی جنگ کا ڈول ڈالا ہے وہ جنگ پچھلی تمام تحریکوں اور آزادی کی جنگلوں کا نچوڑ دکھائی دیتی ہے اور اس سے پہلے جن تحریکوں کو سالہا سال میں میں بھی اتنی قربانیاں نہیں دینی پڑی تھیں جتنی فلسطینی تحریک آزادی نے چند ہفتوں میں دے کر پورے عالم کے ضمیر کو ہلا ڈالا ہے۔

یہ معرکہ کرب و بلا اپنے اندر بے پناہ پہلو لیے ہوئے ہے اور ہمارے ہاں کا جو دانشور اسکو صرف انسانی مسئلہ کہہ کر تشویش کا اظہار کرنے لگتا ہے وہ تمام احساسات کے باوجود مکمل سچائی اور حقیقت کا ادراک نہیں رکھتا اور خواہ اہل علم ہوں، یا ادیب، و مصور یا موسیقار کوئی بھی اسوقت تک "اس انسانی مسئلے کو" اپنے فن کا موضوع نہیں بنا سکتا جب تک اسے فلسطین کے آج کے مسئلے کے تمام پہلوؤں کا پورا ادراک نہ ہو، اس لیے کہ یہی وہ مقام ہے جب ادب دوسرے علوم کی طرح معاشرتی علوم کا ایک لازمی حصہ نہیں بن جاتا ہے اور ہر ادیب کے لیے اپنے شاہکار کی تخلیق کے لیے عالمی تحریکوں اور بالخصوص آزادی کی تحریکوں کا پوری گہرائی کے ساتھ مطالعہ لازم ہو جاتا ہے کیونکہ آج یہ تحریکیں عالمی سیاست کے تنازعات کا حصہ بن گئی ہیں اور خود مختلف حکومتوں اور حاکم طبقوں کے مفادات سے ٹکرانے لگی ہیں چنانچہ ادیب اور اہل علم کے لیے یہ خاصا کٹھن مقام ہے۔ اس لیے ہمارے ہاں کے اہل علم و ادب کا شاہکار یا فن پارہ تخلیق کرنا تو دور کی بات ہے۔ اس بارے میں وہ رائے بھی قائم کرنے سے گریزاں ہوتے ہیں کیونکہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ عالمی حکومتیں کچھ "مجاہدین" کی حمایت میں تو دن رات ایک کر دیتی ہیں۔ اور دوسرے مجاہدین کو وہ دہشت پسند کہہ کر اسرائیلی کی پیٹھ ٹھونکنے لگی ہیں۔ یہی وہ ادراک ہے جس پر ادیب اور اہل علم کو بالا آخر سوچنا ہوگا کیونکہ امریکہ اور مغرب کے ذرائع ابلاغ پوری کوشش کر رہے ہیں کہ دنیا والے سچائی تک نہ پہنچ سکیں لیکن مزاحمت کی اور اس مزاحمت کی راہ میں بہنے والے خون اور قربانی کی ایک اپنی منطق ہوتی ہے۔

اور خون اور قربانی کی یہ منطق بالا آخر ذرائع ابلاغ کی تمام دبیز تہوں کو چاک کر کے رکھ دیتی ہے اور سچ اور حقیقت کا جادو سر پر چڑھ کر بولنے لگتا ہے چنانچہ آج فلسطینیوں کی آزادی کی تحریک نے اپنی قربانیوں کے ذریعے سامراجیوں اور ان کے دوستوں کی تمام ریشہ دوانیوں، سازشوں کو نہ صرف بے نقاب کر دیا ہے بلکہ اپنی قربانیوں سے انہوں نے رائے عامہ کو جس طرح متاثر کیا ہے۔ اس سے بین الاقوامی سامراج اور ان کے دوست حاکم طبقوں اور ان ممالک کے عوام کے درمیان تضادات کو آشکارا کر دیا ہے اور روز بروز تضادات کی ایک ایسی خلیج بنتی جا رہی ہے جو نہ پاٹی جا سکتی ہے۔ نہ عبور ہو سکتی ہے یہ تو سانپ کے منہ میں چھچھوندر ہے جسے نہ کھائے بنتی ہے نہ چھوڑے کیونکہ حاکموں کے لیے ہر طرح سے زیاں ہی زیاں ہے۔

فلسطینی مزاحمت کا کردار

فلسطینی مجاہدین آج ایک حد تک تن تنہا اسرائیل کی جس جارحیت کے خلاف سینہ سپر ہیں اس کی پوری ماہیت پر غور کرنا چاہیئے۔ کیونکہ سیاسی تحریک ہو یا مزاحمتی تحریک، ان تحریکوں کا کوئی بھی چہرہ ہو، کوئی بھی روپ ہو، کوئی بھی منشور ہو یا کوئی بھی نظریہ ہو آخر کار یہ تحریکیں طبقاتی کشمکش کا ہی مظہر ہوتی ہیں۔ درست ہے کہ بظاہر یہ کشمکش سات پردوں میں چھپی ہوتی ہے سیاستدانوں یا مجاہدین کے قائدین کی چکنی چپڑی باتوں اور رومانی نعروں کی دبیز تہیں اس کشمکش پر چڑھی ہوتی ہیں، پھر ایسے سیاستدان جو حاکم بھی ہوتے ہیں اپنے ذرائع ابلاغ کے ذریعے اس کشمکش کے صحیح پہلوؤں کو عامۃ الناس کی آنکھوں سے اوجھل کرنے کا پورا جتن کرتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا کہ عوام کو صحیح صورت حال کا علم نہ ہونے پائے تاکہ وہ متحرک نہ ہوں، اب اسرائیلی اور فلسطینی مجاہدین کے درمیان جو مسلح تصادم ہو رہا ہے وہ اس دور کی سب سے بڑی طبقاتی کشمکش ہے۔ ضروری نہیں ہوتا کہ فوری طور پر محرومین کو کامیابی ہو جائے۔ چنانچہ اس پس منظر میں فلسطینی مجاہدین کی جدوجہد کو دیکھا جائے۔ تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تصادم صرف ایک خطے یا ایک ملک میں مسلح تصادم اور کشمکش نہیں ہے بلکہ یہ پوری دنیا میں رونما ہونے والے تصادم اور کشمکش کا اظہار ہے۔ اس لیے یہ ضروری نہیں کہ یہ مسلح تصادم تیسری جنگ کی بھی صورت اختیار کر جائے۔ لیکن یہ مسلح تصادم پوری دنیا اور بالخصوص عرب ممالک کے محروم عوام کو متحرک و منظم کرنے میں زبردست مددگار ثابت ہوگا۔ اور اس کا اظہار بھی شروع ہو گیا ہے۔ اور جب یاسر عرفات اپنی مزاحمت اور تصادم کو پورے عربوں کے انقلاب کا نام دیتا ہے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟

اس تصادم میں تو بظاہر اسرائیل اور فلسطینی مجاہدین آزادی کی تنظیم۔ دو فریق ہیں لیکن اصل میں یہ دونوں فریق عالمی سطح پر اہل زر اور زمین کی ایک طرف اور زر و زمین سے محرومین کی دوسری طرف نمائندگی کر رہے ہیں۔ ایک طرف فلسطینی ہیں۔ جن کے پاس نہ مکان ہے، نہ زمین، نہ وطن ہے، نہ اقتدار، وہ زمین، مکان، وطن اور ایک آسودہ پر امن زندگی کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور اسی کے لیے وہ مصروف پیکار ہیں دوسری طرف اسرائیل ہے جس نے فلسطینی عوام کی زمین، مکان اور وطن سب کچھ ہتھیا لیا ہے اور بزور طاقت نصف صدی سے دنیائے عرب کے دل میں خنجر پیوست کئے ہوئے ہے۔ اب اس کشمکش میں، اس تصادم اور جنگ میں جیسے جیسے فلسطینیوں کے خون سے عرب کی سرزمین لالہ زار بنتی جا رہی ہیں، ملک ملک اور شہر شہر میں عوام گلی کوچوں میں نکل رہے۔ اور فلسطینیوں کے حق میں نعرے لگا رہے ہیں وہ "مرگ بر اسرائیل و امریکہ" کی آوازیں بلند کر رہے ہیں اور تو اور خود اسرائیل کے اندر عوام ہزاروں کی تعداد میں اپنے حاکموں کی جارحیت کے خلاف مظاہرے کر رہے ہیں، جیسے جیسے یہ نعرے بلند ہو رہے ہیں ویسے ہی عرب بادشاہتیں بھی لرزہ براندام

ہو رہی ہیں چنانچہ ایک طرف دنیا بھر کے محروم متحرک اور منظم ہو رہے ہیں دوسری طرف تمام اہل زر زمین کی ہمدردیاں اسرائیل کے ساتھ ہیں، منہ زبانی یہ اہل زر جو مرضی ہے کہتے رہیں، مذہب اور انسانیت کے نام پر فلسطینی مجاہدین سے کتنی بھی ہمدردیاں جتاتے پھریں لیکن دل ہی دل میں وہ فلسطینیوں کے خاتمے کے خواہاں ہیں لیکن عوامی دباؤ نے ان کو لرزہ براندام کر دیا ہے، کیونکہ ان کے خواب اور تمام منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے ہیں، کیونکہ جب محرومین اور اہل زر دزمین میں تصادم اور کش مکش شروع ہوتی ہے۔ تو یہ عمل زبردست تضادات کو جنم دیتا ہے اور یہ تضادات ہی اہل زر کی صفوں میں دراڑیں اور انتشار پیدا کرتے ہیں اور بالآخر یہی تضادات اتنے گہرے ہو جاتے ہیں جو اہل زر کو لے ڈوبتے ہیں یہی عمل مدتوں ویت نام میں جاری و ساری رہا یہی معرکہ افریقہ اور لاطینی امریکہ میں اسوقت بھی بپا ہے اور یہی تاریخی عمل اب مشرق وسطےٰ میں کھل کر سامنے آ رہا ہے۔

تضادات جنم کیسے لیتے ہیں؟ اسرائیل کی جارحیت اور فلسطینیوں کی جرأت مندانہ مزاحمت نے ان تضادات کو واضح کیا ہے اب تک عربوں کی اور اسرائیل کے درمیان جتنے بھی معرکے ہوئے جتنی بھی جنگیں ہوئیں، جتنی بھی لڑائیاں لڑی گئیں ان میں فلسطینی براہ راست مصروف پیکار نہیں ہوئے، یہ تمام لڑائیاں اور جنگیں مختلف عرب ممالک کی حکومتوں اور اسرائیل کے درمیان ہوئیں اور ان سب میں اسرائیل نے امریکہ کی مدد سے چند دنوں کے اندر اندر کامیابی حاصل کر کے عربوں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا اس لیے اولاً عالمی رائے متحرک ہونے سے پہلے ہی سکتے میں آ گئی اور نہ تو وہ متحرک ہو پائی اور نہ ہی منظم دوسرے خود عرب حکومتوں کی کارکردگی نے دنیا بھر کے آزادی پسند عوام کو مایوس کیا اور ان کا عربوں پر سے اعتقاد ہی اُٹھ گیا۔ یہ عمل ایک بار نہیں قریب قریب تین چار بار دہرایا گیا چنانچہ اس وجہ سے تضادات ابھرنے نہ پائے، مزید برآں ایک اور وجہ بھی تھی اسرائیل اور عرب حکومتوں کے درمیان جتنی بھی لڑائیاں لڑی گئیں ان میں فلسطینیوں کو براہ راست اپنی قیادت کے پرچم تلے مصروف پیکار ہونے کا موقع نہیں ملا اور اس طرح اسرائیل کی فوج کو عوامی فوج سے مقابلہ نہیں کرنا پڑا تھا لیکن اس بار اسرائیل کو ایک بالکل نئی قسم کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اس مزاحمت نے اسرائیل اور امریکہ کے منصوبوں کو نہ صرف خاک میں ملا دیا ہے بلکہ ان کے پورے خواب چکنا چور ہو گئے ہیں اور پہلی بار عالمی سطح پر نئے اور نہایت شدید تضادات ابھرے ہیں اس نئی صورت حال کے چند اہم پہلو یہ ہیں۔

۱۔ امریکہ اور اسرائیل کا خیال تھا کہ اسرائیل کا آناً فاناً حملہ چند گھنٹوں میں فلسطینیوں کو تہس نہس کر دے گا اور زیادہ سے زیادہ دو اڑھائی دن فلسطینی مزاحمت کر سکیں گے۔ اس کے بعد شکست ان کا مقدر ہوگی اور بیشتر اس کے کہ عالمی رائے متحرک ہو معرکہ سر ہو چکا ہوگا۔

۲۔ لیکن ہوا کیا مزاحمت خلاف توقع طویل ہو گئی ہے اتنی طویل کہ تمام پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی ہے

۳۔ اور اب اس طویل اور جان لیوا مزاحمت نے عالمی رائے عامہ کو متحرک اور منظم ہونے کا موقع مہیا کر دیا ہے۔

۴۔ فلسطینی مجاہدین کی بہادری اور جیالے پن نے ایک عالم سے اپنا لوہا منوا لیا ہے اور اب تمام ممالک جن میں عرب بادشاہتیں بھی شامل ہیں سر پکڑے بیٹھی ہیں کیونکہ جب عالمی رائے عامہ متحرک اور منظم ہونے لگتی ہے تو وہ رجعت پسند اور سامراجی حاکموں کو بھی جن کی ہمدردیاں اسرائیل کے ساتھ ہوتی ہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کرتی ہے۔ چنانچہ چند مہینے یا چند ہفتے پہلے کوئی شخص بھی امریکی وزارت خارجہ کے منصب سے جنرل ہیگ سے مستعفی ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

اب ان تضادات نے واضح ہونا شروع کیا ہے اور اب عالمی رائے عامہ امریکہ اور اسرائیل کو قدم بہ قدم پیچھے ہٹنے پر مجبور کر رہی ہے چنانچہ اگر ایک طرف فلسطینیوں کی بہادری اور جوانمردی نے ایک عالم کو متاثر کیا ہے تو دوسری طرف اسرائیل کی بربریت نے عالمی برادری کے ضمیر کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے اور دنیا ورطۂ حیرت میں پڑ گئی ہے کیونکہ اسرائیل کی آبادی نے ایک عالم سے ہمدردی اپنی مظلومیت کی بنا پر ہی حاصل کی تھی۔ ایک عالم یہ سمجھتا تھا کہ ہٹلر نے یہودیوں پر جو مظالم توڑے ہیں ان کا تقاضا ہے کہ اسرائیل کو ایک محفوظ و مامون خطہ زمین حاصل ہو لیکن اب اسرائیل نے جو مظالم فلسطینیوں پر اس جارحیت کے دوران میں توڑے ہیں اس نے ہٹلر کے مظالم کو بھی پس پشت ڈال دیا ہے چنانچہ اسرائیل کے اس ظلم و تشدد اور بربریت نے دنیا بھر کے عوام کو جہاں ایک طرف متاثر کیا ہے وہیں خود امریکی عوام کو بھی اسرائیل سے قدرے بدظن کر دیا ہے اس ردعمل نے ریگن انتظامیہ کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا ہے اور وہ آہستہ آہستہ نئے موقف اپنانے پر مجبور ہونے لگی ہے

یہ عمل جو عالمی سطح پر دیکھنے میں آ رہا ہے کوئی ایک دن میں ظہور پذیر نہیں ہو جاتا اس عمل میں کئی رکاوٹیں بھی ناکامیاں بھی شکستیں بھی شامل ہیں لیکن اس کے باوجود یہ ایک طویل عمل کا اجرا ہے۔ اس میں بے صبری نہیں ہوتی، یہ عشق کی منزل ہے جو صبر کی طالب ہوتی ہے۔ فلسطینی چالیس برس سے مصروف عمل ہیں اور ان کی تحریک کئی ادوار سے گذری ہے لیکن ہر دن جو گذرا ہے اس میں ان کی طاقت میں، اثر و رسوخ میں، ان کی عالمی تائید میں اضافہ ہوا ہے اور جو تو وہ ایک ایسی طاقت ہے جس کو شکست ہو سکتی ہے لیکن یہ شکست وقتی ہوگی۔ اب کوئی طاقت ان کو ختم نہیں کر سکتی، یہ ایک حقیقت ہے، یہ ایک صداقت ہے اور ہمارے ہاں کے اہل علم کو اس حقیقت اور صداقت کو پوری گہرائیوں کے ساتھ جاننا چاہیئے، سردار جعفری نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

دیکھ یہ اپنے خونیں کفن میں
تیرے لاکھوں شہیدوں کی روحیں کھڑی
ہیں۔
جو تجھے تہنیت دے رہی ہیں
ان کی آنکھیں حسرت کے اشکوں سے
نمناک ہیں۔
لیکن ان کے گریباں ابھی چاک ہیں
ان کو اپنی محبت سے سی دے
پرچموں سے کہو کھل کے انگڑائیاں لیں
فوجیں اپنی شکستہ صفوں کو جگائیں
فتح اور کامرانی کے ڈنکے بجائیں۔

●●●

یہودی ریاست اور فلسطین

تحریر: ارنلڈ ٹوائن بی

(ممتاز برطانوی مورّخ آرنلڈ ٹوائن بی کا یہ مضمون اگرچہ پرانا ہے لیکن مسئلہ فلسطین، اسرائیلی ریاست اور عرب اتحاد کو انہوں نے ایک مورّخ کی نظر سے صحیح پس منظر میں رکھ کر دیکھا ہے اس لیے ہم اسے شائع کر رہے ہیں)۔

مسئلہ فلسطین کے دو پہلو ہیں انسانی اور سیاسی مگر ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک پہلو پر غور کرتے وقت دوسرے کو بھی مدنظر رکھنا ناگزیر ہے۔ مسئلہ فلسطین کا انسانی پہلو سے جائزہ لینا چاہتا ہوں اس کے ساتھ ہی اس کے سیاسی پہلو کا ذکر آنا بھی ضرور ہے انسانی پہلو سے میری مراد ان لاکھوں مردوں عورتوں اور بچوں کی حالت زار ہے جن کو گھروں سے نکال دیا گیا ہے۔ اور اپنی املاک اور سب سے بڑھ کر اپنے مستقبل سے محروم کر دیا گیا ہے اس موقع پر مجھے غازہ کے علاقہ میں واقع تارکین وطن کے ان کیمپوں کا خیال آ رہا ہے۔ جہاں میں گیا تھا مجھے وہ اسکول بھی یاد ہیں جہاں ان بچوں کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا تھا۔ مگر اس بات کی کوئی یقین دہانی نہیں کرائی گئی کہ یہ بچے بڑے ہو کر بہتر حالات زندگی بسر کر سکیں گے۔ ان کا مستقبل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ تمام عمر تارکین وطن کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ ایک قوم کو موت سے دہشت زدہ ہو کر اپنے گھروں کو خیرباد کہنا پڑا ہو۔ آٹھویں اور چھٹی صدی قبل از مسیح میں بھی فلسطین کی دو چھوٹی چھوٹی مملکتوں اسرائیل اور یہودیہ کے لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال کر دریائے اُردن کے مغربی علاقہ میں دھکیل دیا گیا (یہ علاقہ موجودہ اردن کا حصہ ہے) یہ ایک اخلاقی المیہ ہے کہ ان یہودی تارکین کی نسل اپنے آباؤ اجداد کا بدلہ فلسطین کی موجودہ عرب آبادی سے لے۔ اگر ہم وہی مظالم دوسروں پر توڑیں جن کے ہم خود شکار ہو چکے ہیں تو کیا نسل انسانی کی بہتری کی کوئی امید ہو سکتی ہے حالانکہ اس تجربے کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی ہمیں دوسروں پر ظلم کرنے سے احتراز کرنا چاہیئے۔

غالباً ماضی میں یہ ایک تسلیم شدہ امر تھا کہ نسل انسانی جن مصائب سے دوچار ہوتی ہے وہ معمول کا حصہ ہیں۔ مگر اب ایک قوم کے ہاتھوں دوسری قوم سے ایسے سلوک کی تمام دنیا میں مذمت کی جاتی ہے۔ فلسطین عربوں کو ان کے گھروں اور املاک سے جبراً محروم کر کے اسرائیلیوں نے (اپنے ماضی کی روشنی میں) نہ صرف اپنے ضمیر بلکہ تمام بنی نوع انسان کے ضمیر کے خلاف قدم اٹھایا ہے اور پھر فلسطینی عرب بالکل بے گناہ ہیں کیونکہ مصائب کا شکار ہونے والے انسانوں کی بھاری تعداد ہمیشہ بے گناہ ہوتی ہے۔ ذرا ان جرمنوں کا خیال کیجئے جو دوسری جنگ عظیم کے بعد پولینڈ اور روس میں شامل ہونے والے جرمن علاقوں، چیکوسلواکیہ اور مشرقی جرمنی میں دھکیل دیئے گئے تھے۔ گو یہ سب جرمن شہری تھے۔ اور ہٹلر کو برسر اقتدار لانے اور برسر اقتدار رہنے کی ذمہ داری کسی حد تک ان پر عائد ہوتی تھی۔ اس لیے نازیوں کی طرف سے توڑے گئے مظالم کے تھوڑے بہت ذمہ دار یہ لوگ بھی تھے۔ یہ درست ہے کہ جلاوطنی بہت بڑی سزا ہے۔ مگر ان سب کو نازیوں کے مظالم سے بالکل بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس کے برعکس فلسطینی عرب ان مظالم سے بالکل بری الذمہ ہیں۔ جو نازی دور حکومت میں جرمنوں نے یہودیوں پر توڑے تھے۔ کیونکہ یورپی یہودیوں کا قتل فلسطینی عربوں نے نہیں بلکہ جرمنوں نے کیا تھا۔ ان حقائق کے باوجود جرمنی کی شکست اور نازی حکومت کے خاتمہ کے بعد فاتح مغربی طاقتوں نے باقی ماندہ یہودیوں کو اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ فلسطینی عربوں کے مفاد کی قیمت پر اپنے نقصانات کی تلافی کر لیں۔

یہ بات تو سمجھ میں آ جاتی ہے کہ یہودی نازیوں کے مظالم کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات کا مطالبہ کر دیں کہ ان کو دنیا میں ایک ایسا قطعۂ ارضی دے دیا جائے جہاں وہ خود اپنی قسمت کے مالک ہوں اور جہاں ہر ایسے یہودی کو پناہ مل سکے جس کو آئندہ ایسے ہی مظالم کا شکار ہونے کا خدشہ ہو۔ مگر یہودیوں کو اپنا یہ مطالبہ اس مغربی ملک سے پورا کرنا چاہیئے تھا۔ جس نے یہودیوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ اور اگر باقی ماندہ یہودیوں کی اشک شوئی کرنے کے لیے اسرائیل کی نئی مملکت کا قیام ضروری سمجھا گیا تھا۔ تو ایسی مملکت کے قیام کے لیے علاقہ یورپیوں سے حاصل کیا جانا تھا کہ عربوں سے عرب فلسطین کو تقسیم کر کے اسرائیل کا قیام عمل میں لانا بالکل غلط اقدام ہے۔ بلکہ ایسی مملکت مرکزی یورپ میں قائم کی جانی چاہیئے تھی۔ یہ نکتہ نہایت سیدھا سادا اور واضح ہے مگر ایک مرتبہ مغربی جرمنی (جرمنی یا برطانیہ) میں ایک لیکچر کے دوران جب میں نے یہ نکتہ پیش کیا تو اس پر بہت مذاق اڑایا گیا۔ میرے سامنے یہودی نہیں بلکہ غیر یہودی یورپی تھے۔ اور ملک بھی وہ تھا جو روایتی طور پر نوآبادیاتی نظام کے خلاف ہے۔ مگر اس کے باوجود میری تجویز کا مذاق اڑایا گیا۔ کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک یہ امر نہایت مضحکہ خیز تھا کہ کسی یورپی ملک کو اپنے جرائم کے ازالہ کے لیے اپنا کچھ حصہ دینے کے لیے بھی کہا جا سکتا ہے۔ حالانکہ اخلاقی طور پر یورپ کو ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا۔ مگر یورپ نے اپنے اخلاقی جرائم کا بدلہ اس طرح لیا کہ یہودیوں کو ایک غیر یورپی ملک کے علاقہ پر مسلط کر دیا۔ اس ہنسی اور مذاق سے مجھے شدید صدمہ پہنچا۔ کیونکہ اس کی تہہ میں نوآبادیاتی رجحان پوشیدہ تھا ایک مجرم مغربی ملک کے علاقہ کو تو مقدس سمجھ لیا گیا کیونکہ مجرم ہونے کے باوجود مغربی قوم تھی۔ اس کے برعکس یہ بات قابل قبول تسلیم کر لی گئی کہ فاتح مغربی طاقتیں ایک بے گناہ مگر غیر مغربی قوم کا علاقہ یہودیوں کے سپرد کر دیں۔ حالانکہ یہ ان تمام حقوق انسانی کی صریحاً خلاف ورزی ہے جو یقیناً دنیا کے ہر مرد عورت اور بچے کو ملنا چاہئیں۔ خواہ وہ کسی مذہب نسل، قوم یا تمدن سے تعلق رکھتے ہیں۔

بطور ایک انگریز کے میرے لیے اس ذمہ داری

کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جو اس سلسلے میں برطانیہ پر عائد ہوتی ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ برطانیہ پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیونکہ وہ قریباً ۳۰ سال (۱۹۱۸ء، ۱۹۴۸ء) تک فلسطین پر قابض رہا ہے اور یہ قبضہ ختم ہونے کے فوراً بعد ہی فلسطینی عرب شدید مصائب کا شکار ہو گئے اعلان بالفور کی ذمہ داری بھی برطانوی حکومت پر عائد ہوتی ہے برطانیہ کی کوشش کا نتیجہ تھی جس کے تحت ۱۹۲۲ء میں فلسطین برطانیہ کے انتظام میں آیا میرے نزدیک برطانیہ دو کھلی غلطیوں کا مرتکب ہوا ہے ایک تو برطانیہ نے فلسطینی عربوں اور صیہونی یہودیوں کے ذہنوں میں ایسے توقعات پیدا کر دیں جو ایک دوسرے سے قطعی مختلف تھیں دوسرے وہ اپنے تفویضی دور میں اس صورت حال کا سامنا کرنے سے گریز کرتا رہا جو خود اس کی پیدا کردہ تھیں اور نہ ہی وہ کوئی واضح پالیسی وضع اختیار کر سکا برطانیہ نے فلسطینی عربوں کو یہ امید دلائی [illegible] فلسطین [illegible] ان کی قومی مملکت قائم کر دی جائے گی۔

فلسطین میں برطانوی انتداب کی نوعیت درجہ اول کی تھی جس کے تحت برطانیہ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ فلسطین کے عوام کو بطور ایک خود مختار قوم کے آزادی کے لیے تیار کرے گا جس وقت اس انتداب کی دستاویز تیار کی گئی اور اس پر عملدرآمد شروع ہوا تو فلسطین کی ۹۰ فیصد آبادی عربوں پر مشتمل تھی اس لیے عرب یہ توقع رکھتے ہیں جو بجانب تھے کہ اس دستاویز کی رو سے قائم ہونے والی آزاد مملکت ایک خالصتاً عرب قومی مملکت ہوگی۔ جس میں یہودیوں اور غیر عربوں کی ایک مختصر سی اقلیت بھی ہوگی اس کے ساتھ ہی برطانیہ نے صیہونی یہودیوں کے دلوں میں یہ توقع بھی پیدا کر دی کہ فلسطین میں ایک روز یہودیوں کی ریاست قائم ہو جائے گی۔ تاہم عرب ایسی توقعات رکھنے میں زیادہ حق بجانب تھے کیونکہ اعلان بالفور اور انتداب کی دستاویز میں یہودیوں کو ایک قومی گھر دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔

فلسطین میں یہودیوں کی قومی مملکت کے قیام کا ذکر تک نہ تھا اور لفظ "قومی گھر" کی کوئی وضاحت نہ کی گئی اس کے ساتھ ہی کوئی ایسا واضح بیان بھی موجود نہ تھا کہ اس کا مقصد فلسطین میں یہودی مملکت کا قیام نہیں ہے ادھر برطانیہ بھی اس امر سے بخوبی آگاہ تھا کہ یہودی مملکت کا مطلب وہی ہے جو صیہونی چاہتے ہیں اور جس کے لیے وہ کام کر رہے ہیں ان حالات میں صیہونیوں کے لیے یہ توقع رکھنا قدرتی امر تھا کیونکہ برطانیہ نے یہودی ریاست کے قیام کی واضح طور پر مخالفت نہیں کی ہے اس لیے وہ "قومی گھر" کو مملکت بنانے کی بھی مخالفت نہیں کریگا۔

ان حقائق کی روشنی میں ایک وکیل تو یہ بات ثابت کر سکتا ہے کہ برطانیہ نے عربوں اور یہودیوں سے جو وعدے کیے وہ لسانی طور پر ایک دوسرے سے متضاد نہ تھے مگر عملی طور پر وہ توقعات زیادہ اہمیت کی حامل ہیں جو ان وعدوں نے طرفین کے دلوں میں پیدا کر دیں، اور یہی توقعات ایک دوسرے سے متصادم تھیں اور اس تصادم نے ہی فلسطینی عربوں اور صیہونی یہودیوں کے درمیان تنازعات کو جنم دیا۔

برطانیہ نے اپنے دور انتداب میں نہ تو اپنی پیدا کردہ صورت حال کا سامنا کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی وہ اس مسئلہ کے متعلق کوئی واضح پالیسی وضع کر کے اس کو عملی جامہ پہنا سکا۔ اس تنازعہ کا واحد حل یہی تھا کہ برطانیہ کوئی واضح پالیسی اختیار کرتا بلکہ اس کو عربوں اور یہودیوں پر بھی نافذ کرتا خواہ اس طرح طرفین میں سے کسی ایک کو ناکامی ہوتی۔ ایسی صورت میں ذمہ داری برطانیہ پر ہی عائد ہوتی ہے۔ برطانیہ کو چاہیے تھا کہ وہ اپنے دور انتداب کے ابتدائی مرحلہ میں ہی کوئی واضح فیصلہ کرتا اور اعلان کرتا کہ "آزاد فلسطین" اور فلسطین میں یہودیوں کے قومی گھر کی کیا صورت ہوگی اس کے علاوہ برطانیہ اس بات کا بھی فیصلہ کر سکتا تھا کہ ایک متحدہ فلسطینی ریاست قائم کی جائے گی۔ جہاں عربوں کی اکثریت ہوگی مگر اس میں یہودی اقلیت کے لیے قومی گھر کی بھی گنجائش ہوگی۔ یا پھر فلسطین کو اس طرح تقسیم کیا جاتا کہ اس کا بڑا حصہ عربوں کو ملتا اور نسبتاً کم علاقہ یہودیوں کے حوالے کیا جاتا۔ اس کے برعکس برطانیہ شروع سے آخر تک کوئی واضح فیصلہ کرنے سے ہچکچاتا رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ برطانیہ ایسا فیصلہ عربوں اور یہودیوں کو ناراض کیے بغیر نہیں کر سکتا تھا اور وہ دونوں کی ناراضگی سے گھبراتا تھا۔ حالانکہ برطانیہ کو چاہیے تھا کہ وہ یورپ میں یہودیوں پر نازیوں کے مظالم شروع ہونے سے قبل ہی کوئی واضح منصوبہ وضع کر لیتا اور یورپ سے آنے والے یہودی تارکین وطن کو فلسطین میں پناہ دی جاتی۔ اس کے برعکس برطانیہ، امریکہ کو چاہیے تھا کہ وہ انسانیت کے نام پر اپنے دروازے ان یہودیوں کے لیے کھول دیتے جو ایک مغربی ملک کے مظالم کا شکار تھے یہ دونوں ملک تباہ کن سیاسی نتائج کا سامنا کیے بغیر ہی ان یہودیوں کو اپنے معاشرے میں کھپا سکتے تھے۔ جبکہ ان یورپی یہودیوں کے فلسطین میں داخلے نے عربوں کے لیے بے شمار مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ ان حالات میں میں اپنے ملک کو اس المناک صورت حال کا ذمہ دار قرار دینے میں حق بجانب ہوں جو آج فلسطین میں موجود ہے۔

فلسطین کی موجودہ صورت حال انتہائی نازک ہے مگر فلسطین کے مہاجر اپنے حقوق سے دستبردار نہیں ہوئے ہیں انہیں ہنوز اپنے گھروں اور اپنے ملک میں رہنے کا حق حاصل ہے درحقیقت ان کو دنیا کے ہر شخص کی طرح بنیادی انسانی حقوق حاصل ہیں ایسے دور میں جبکہ انسانی حقوق مسلم ہیں اور ان کو متنازعہ فیہ نہیں بنایا جا سکتا۔ عربوں کے انسانی حقوق کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ جب تک فلسطین کے عربوں سے انصاف نہیں کیا جائے گا مسئلہ فلسطین کا کوئی حل دیرپا ثابت نہیں ہوگا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مستقبل میں دیگر عرب ممالک فلسطینی عربوں کی کس طرح امداد کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس مسئلہ پر ایک غیر ملکی کے لیے اپنی رائے پیش کرنا نہایت نازک امر ہے تاہم میں اپنی رائے ظاہر کرنے کی جرأت کرتا ہوں، میرے نزدیک ان کی مدد اسی طرح کی جا سکتی ہے کہ عالم عرب میں مجموعی طور پر ایک قریبی اور مؤثر اتحاد کے قیام کے لیے ایک تحریک کی جائے۔ کہتے ہیں کہ اتحاد میں قوت ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تمام عالم عرب متحدہ آواز بلند کرے تو یہ آواز تمام دنیا میں سنی جائے گی۔ بلکہ اس آواز سے فلسطینی عربوں کے مصائب کا دور کم ہو جائے گا ہمیں ان تمام مشکلات کا احساس ہے جو عرب اتحاد کی راہ میں حائل رہی ہیں۔ ان میں سے بعض مشکلات عالم عرب سے باہر آئی ہیں اور بعض مشکلات اندرونی

پیداوار ہیں اگر عرب چاہیں تو دنیا کی کوئی طاقت ان کو اپنی اندرونی مشکلات دور کرنے سے نہیں روک سکتی۔

میں بطور ایک مورخ کے موجودہ مسائل کو تاریخ کی روشنی میں دیکھنے کا عادی ہوں مجھے وہ وقت یاد ہے جب دنیائے عرب کمزور اور بٹی ہوئی تھی میرا اشارہ صلیبی جنگوں کی طرف ہے۔ پہلی صلیبی جنگ نے عربوں اور اسلام کے لیے ایسے ہی عظیم مسائل پیدا کر دیئے تھے۔ جیسے کہ اسرائیل کے قیام نے پید لکئے ہیں۔ پہلی ہی صورت میں عربوں کا ردعمل فوری نوعیت کا نہیں تھا مگر انجام کار عرب ایک مضبوط اتحاد قائم کرنے اور خود کو درپیش خطرے کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ عالم عرب ایک وسیع دنیا ہے اور یہ قدرتی امر ہے کہ ایسی تحریک پھیلنے میں کافی عرصہ لگ جائے جو تمام عرب ملکوں میں اتحاد و تعاون کا رشتہ قائم کر سکے مستقبل کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے اس بات کا یقین ہے کہ موجودہ حالات میں اتحاد کی تحریک ضرور پھیلے گی جیسا کہ آٹھ سو سال قبل پھیل تھی۔

آج بھی تمام دنیائے عرب پر شدید بیرونی دباؤ پڑ رہا ہے فی زمانہ کسی ملک کے لیے تنہا زندہ رہنا روز بروز مشکل بنتا جا رہا ہے اور ہم دور اتحاد کی طرف گامزن لاہیں حتٰی کہ یورپی اقوام بھی گیارہ سو سال تک بٹے رہنے کے بعد باہمی اتحاد کی طرف گامزن ہیں۔

میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپی عوام اب اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ ان کو اتحاد اور تنزلی میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہی وجوہات دنیائے عرب اور دیگر علاقوں میں بھی ایسے ہی نتائج پیدا کریں گی۔

یورپی لوگوں کو چاہیئے کہ وہ عرب اتحاد کے نظریہ کی طرف ہمدردانہ رویہ اختیار کریں کیونکہ عالم عرب کی صورت حال مغربی دنیا سے مختلف ہے مغرب کا خیال ہے کہ وہ ایسی تہذیبی روایات کا حامل ہے جو تمام نوع انسانی کے لیے مجموعی طور پر قابل قدر ہیں اور اپنی ان روایات کو برقرار رکھنا چاہتا ہے تاکہ یہ انسانیت کے مشترکہ تہذیبی خزانہ کے لیے ایک قابل قدر سرمایہ بن سکیں۔ دنیائے عرب نے بھی اس مشترکہ تہذیبی خزانہ میں کافی اضافہ کیا ہے اس لیے عرب اتحاد اور نشاۃ ثانیہ سے تمام دنیا کو فائدہ ہی پہنچ سکتا ہے۔ اور عرب اپنے دوسرے ساتھیوں کو کافی کچھ دے سکتے ہیں۔

مجھے معلوم ہے کہ میں اس مسئلے پر بحث کر رہا ہوں جو نازک بھی ہے اور متنازعہ فیہ بھی اس کے باوجود میں اس رائے کے اظہار کی جرأت کر رہا ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے میرا کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہیں ہے بلکہ میں فلسطینی عربوں اور دنیائے عرب کا خیرخواہ ہوں۔ عرب اتحاد کا مسئلہ یقیناً نہایت نازک ہے پھر بھی میری خواہش ہے کہ فلسطینی مہاجرین کی بڑی سے بڑی تعداد کو نہ صرف اپنے گھر اور اپنی املاک واپس مل جائیں بلکہ وہ ایک فلسطینی عرب حکومت کے تحت اپنے گھروں کو واپس جا سکیں۔ اس دوران میری خواہش ہے کہ عرب مہاجرین کی زندگی ہر ممکن حد تک قابل برداشت بنا دی جائے۔

انسانی تاریخ میں شائد آج تک کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا گیا جس کے متعلق موضوعی اور معروضی تمام عوامل کا مکمل علم پہلے سے رہا ہو اور اس معاملے میں اور آج کے پیچیدہ دور میں ایسے عناصر کا ایک فیصد حصہ بھی بہت زیادہ ہوتا ہے جس کے متعلق پہلے سے ذہنی طور پر مکمل علم حاصل نہ ہو۔ پہلے سے شائد نامعلوم عناصر کا حصہ ہی زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ علم الوجود کے اعتبار سے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر عملی اقدام سے پہلے یہی حالت ہوتی ہے۔ بعد میں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ تاریخ میں بالکل غلط نظریئے کی بنیاد پر لوگوں نے صحیح عملی اقدام کئے ہیں۔ اس کی اہم مثال یہ ہے کہ اسکندریہ سے ایتھنس کا سفر بطلیموس کے نظریات پر مبنی علم الافلاک پر طے ہوتا ہے اور پھر بھی لوگ ٹھیک اپنی منزل پر پہنچ جاتے ہیں حالانکہ اس کی نظریاتی بنیاد غلط تھی۔ ہمیں انسانی عمل کی اس بات کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیئے کہ علم کتنا ہی کیوں نہ ہو، انسان کو عملی قدم تو بہرحال اٹھانا ہی پڑتا ہے۔ اگر کہرے کی حالت میں میں جنگل میں بھٹک رہا ہوں تو بھی گھر واپس پہنچنا ہی ہوتا ہے اور اس کے لئے کوشش اس حالت میں لازمی ہوتی ہے۔ یہ کہنا کہ جہاں میں بھٹک گیا ہوں پہلے زمین کے اس حصہ کا نقشہ تیار ہو جائے اور تب تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا چاہیئے ایک مضحکہ خیز بات ہوگی تب تک میں یقیناً بھوک کی شدت سے مر جاؤں گا۔ چاہے ٹھوکر کھا کر ہی کیوں نہ صحیح راستہ ملے۔ میری کوشش راستہ تلاش کرنے کی ہوگی۔ صحیح نقشے کا انتظار کرنے سے تو بہتر یہی ہے کہ ٹٹول ٹٹول کر راستہ تلاش کیا جائے۔ حالانکہ یہ بھونڈی مثال ہے مگر بات سمجھانے کے لئے مفید ہے۔

لوکاچ اور مارکسی تنقید سے اقتباس

معین بسیسو
ترجمہ: کشور ناہید

جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

معین بسیسو ۱۹۲۷ء میں غازہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے قاہرہ میں امریکی یونیورسٹی سے بی۔اے۔ ادبیات کیا۔ بعدازاں استاد کی حیثیت سے متعین ہوئے، ان کی سیاسی سرگرمیوں کے باعث، وہ نوکری سے برخاست ہوئے اور پھر غازہ، بیروت اور قاہرہ میں بطور صحافی کام کرتے رہے۔
ان کا پہلا مجموعہ العرکہ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا، دوسرا ۱۹۵۷ء میں یہ فلسطینی تحریک کے سرکردہ شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ گذشتہ کچھ عرصے سے فلسطین آزادی کی کارکردگی کمیٹی کے چیئرمین کے ساتھ بطور مشیر کام کرتے رہے ہیں۔ یہ اقتباس، ان کی کتاب "پانی میں اترتا" سے لیا گیا ہے کہ ساری کتاب احوالِ جیل سے متعلق ہے۔ ذیل میں اس کتاب کا ساتواں باب درج کیا جارہا ہے۔

پیلی اینٹوں سے تکون اور چوکور بنے تھے کہ جو انہی اینٹوں سے بنی چار دیواری کے حصار میں تھے۔ دیوار کے ہر کونے میں ایک مینار تھا جس پر پہرے دار متعین تھا۔ جو تھوڑے تھوڑے وقفے پہ آوازیں لگاتا۔ نمبر ایک۔ ٹھیک ہے۔ اس کی آواز کا جواب میں دوسری آواز آتی۔ نمبر دو۔ ٹھیک ہے۔ اور یونہی آواز تیسرے چوتھے سارے میناروں سے ہوتی آپس میں ٹکراتی، فضا میں تحلیل ہوجاتی کہ سحر نمودار ہوتی۔

اتنے میں ایک ڈھکا ہوا ٹرک جیل کے صحن میں داخل ہوتا ہے اس ٹرک میں غازہ سے پکڑ کر لائے گئے مجاہدین ہیں۔

ہم ایک دوسرے کے پیچھے، ٹرک سے نیچے اترتے ہیں۔ انہیں ہماری آمد کا انتظار تھا۔ جیل کے گارڈ اور تین کتے ہمارے گرد حفاظتی دائرہ بنا لیتے ہیں۔ ہمیں ان کتوں کے نام بعد میں معلوم ہوتے۔ ان میں سے دو کتیا تھیں جن کے نام گولڈا اور عنایت تھے اور ایک کتا تھا جس کا نام لکی تھا۔

"خوش آمدید۔۔ فوجی جیل میں"

دو۔ دو میں آگے آئیں۔۔ انہوں نے ہماری لائن بنا دی۔ پہلی لائن میں میرا کامریڈ خلیل عویدا تھا کہ جو مہاجرین کے سکولوں کا ناظم تعلیم تھا۔ میرے پیچھے اس کا اسسٹنٹ فرید ابو وردا تھا۔ اور لائن کے آخر میں مہبا الابرباری تھی۔ وہ فلسطینی یا مصری پہلی خاتون تھی کہ جو فوجی جیل خانے میں لائی گئی تھی، "اٹینشن"۔۔۔ محافظوں کا لیڈر نعرہ کرتا ہوا بید کی طرح پتلا لبوترے چہرے والا وہ سارجنٹ تھا مگر محافظ اسے مسٹر سارجنٹ میجر کہہ کر پکارتے تھے اب لکی، عنایت اور گولڈا، ہمارے گرد تھے۔ اس وقت وہ بس ہم کو سونگھ رہے تھے۔

"اٹینشن"۔۔۔ تم نہیں جانتے کہ تم کیا کر رہے ہو مگر تم اٹینشن پہ ضرور کھڑے ہوا کرو۔۔۔ دونوں پاؤں ملا کر سر کو ہلائے بغیر۔۔۔ بالکل سامنے دیکھتے ہوئے۔۔۔

اور ہم نے ویسے ہی سامنے دیکھنا شروع کردیا۔

سامنے میدان میں کچھ سپاہی ننگے پیر دوڑ رہے ہیں اور ان کے جوتے، انکی گردنوں میں لٹکے ہوئے ہیں۔ سپاہیوں کو اس طرح غیر قانونی سزا دی جاتی ہے۔

جیل کا وارڈن حمزہ بسونی، سامنے آتا ہے۔ دونوں کتیاں اُسے دیکھ کر جوش میں آجاتی ہیں۔ لکی اس پر کودتا ہے اور اس کے گھٹنوں سے لپٹ جاتا ہے۔ محافظ کی جلد کا رنگ بھی اینٹوں جیسا ہو جاتا ہے۔

سارجنٹ میجر ایبن اس کے پاس پہنچتا ہے "پاشا! سب ٹھیک ہے۔

پاشا، لائن پہ پہنچتا ہے۔ لمبا، بھاری آواز، چوڑے شانے، نیلی آنکھیں اور سنہری بالوں والا۔ ہماری طرف دیکھتا ہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے ایسے دیکھتا ہے جیسے آنکھوں ہی سے سونگھ رہا ہو وہ مہبا الابرباری کے سامنے رک کر چیخ کر کہتا ہے۔ "تم ان لوگوں کے ساتھ کیا رہی ہو۔"

"میدان سے پوچھو جو مجھے گرفتار کر کے لائے ہیں۔ میں عورتوں کو فوجی جیل خانے میں نہیں رکھتا ہوں مگر اس نے ہی چار ماہ تک مہبا الابرباری کو الگ سیل میں رکھا "اٹینشن"۔۔۔

ہم "اٹینشن" دینے لگتے ہیں۔ ہم آگے کو دیکھتے ہیں سپاہی اس وقت بھی دوڑ لگا رہے ہیں۔ ان کے جوتے اسی طرح ان کی گردنوں میں جھول رہے ہیں۔

ہم یہ دیکھ کر حیران ہوتے ہیں کہ بسونی کے دفتر کے سامنے ایک بہت بڑا باغ ہے آخر اس جلاد کو اس بوچڑ خانے میں اتنے بڑے اور خوبصورت باغ کی کیا ضرورت ہے۔ اس باغ بھی ویسے کوئی پرندہ نہیں تھا۔ ہاں اس فوجی جیل کے نزدیک ایک پرندہ ضرور تھا اور چیل تھی۔ کھانے کی تقسیم کے دوران، وہ اتر کر محافظ کے گوشت کے پیالے میں سے ایک ٹکڑا اٹھاتی ہے۔ محافظ اسے نہیں روکتا "اسے بھی تو آخر کھانے کو کچھ ملنا چاہیئے۔"

کمیونسٹ قیدیوں میں سے ایک مصری فوج میں سپاہی تھا۔ انہوں نے اُسے اتنا مارا تھا کہ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ پھر انہوں نے اس کے زخموں پر آئیوڈین لگایا، بغیر زخموں پہ پھایا رکھے۔ بلکہ بولے "ہم اِسے ململ سے کیوں ڈھکیں۔"

ایک دفعہ یہ قیدی اپنے محافظ کے ساتھ وارڈ میں آرہا تھا۔ ایک چیل اس کے سر پر آکر لگی۔ اس نے اپنی چونچ ماری اور اڑ گئی۔ محافظ نے اپنا کوڑا اس پرندے کو گستاخی کی سزا دینے کے لیے اٹھایا۔

"اسے اچھا کھانا دینا۔ یہ مہمان ہے"

انہوں نے فلسطینی مہمانوں کے شایان شان یعنی ہمارے لیے کھانے کی میز لگائی تھی، جیسے ہی ہم وارڈ میں داخل ہوئے۔ آہنی دروازہ بند کر دیا گیا۔ اور ہمارا کھانا شروع ہوگیا سارجنٹ میجر ایبن نے محافظین کے ساتھ ہمارے سروں پر ڈنڈا مار کر گنتی شروع کی۔ کوڑوں کی آواز کے ساتھ، دونوں کتوں کے منہ سے بھی وہی آواز نکلنے لگی، جو ہماری چیخوں کی تھی اور لکی کتا تو بالکل پاگل ہو کر بھونکنے لگا۔ جس ریزر سے ہمارے بال کھینچے جارہے تھے، وہ اتنا کند تھا کہ خدا جانے کتنے ہزاروں بار، وہ بے چارہ استعمال ہوچکا تھا، کہ ہمارے بالوں کے ساتھ چمڑی بھی ادھڑی چلی آرہی تھی۔ ریزر، ہمارے سروں پر تھا کوڑے ہمارے کمر پر، سر پہ سے بہتا خون، آنکھوں میں آرہا تھا۔

چنگاری ۳۶۶
۱۵

اور ہم اپنے ہاتھ اٹھا کر آنکھیں صاف بھی نہیں کر سکتے تھے۔

سروں کے اس آپریشن کے بعد، ہر قیدی کو اب ایک ایک ڈیسک کے سامنے لیجایا گیا، کہ جس پر ایک ایک گارڈ تعینات تھا۔ اس گارڈ کو پڑھنا لکھنا نہیں آتا تھا، شاید انہوں نے، ان محافظین کو اپنے مطلب کے حروفِ ابجد سکھائے تھے۔

اپنی اپنی چیزیں۔ میز پر رکھ دو

جن کے پاس رومال تھے، انہوں نے اپنی نقدی، گھڑی، انگوٹھی وغیرہ لپیٹ کر رومال میں رکھدی، جن کے پاس رومال بھی نہ تھے۔ انہوں نے ویسے ہی میز پر اپنی چیزیں رکھدیں اور اب پوچھ گچھ شروع ہوئی۔

"تمہارا نام"

"کے۔ ایس"

اور اب کوڑا منہ پر۔۔۔

"آپ جناب کہیں۔ آپ کتیا کے بچے ہیں"

اور اب اپنا نام بتانے اور سر کہنے کے بعد پھر ایک کوڑا

"میں ایک استاد ہوں سر"

اور اب محافظ چیخا" استاد! اس کا مطلب ہے۔ کمیونسٹ، تم کتیا کے بچے" اب کوڑے تواتر سے پڑنے لگے اور گولڈا اس پر جھپٹنے لگی۔

سوالوں کے بعد، قیدی کو بھاگنے کے لیے کہا گیا اور دو محافظ اس کے پیچھے پیچھے بھاگے ان کے ہاتھ میں کوڑے اور ان ساتھ کتے تھے۔ حتیٰ کہ قیدی اپنے سیل میں پہنچ گیا۔

"تمہارا پیشہ کیا ہے"

"میں سر۔ طالبِ علم ہوں"

طالبِ علم۔ تمہارا مطلب ہے کمیونسٹ۔ تم کتیا کے بچے۔

"تمہارا نام کیا ہے"

"ابو المجید خیال سر"

"تمہارا پیشہ"

"سبزی فروش سر"

محافظ نے خیال کا منہ نوچتے ہوئے کہا "تم کتیا کے بچے۔ ان طالب علموں اور استادوں کے درمیان، تم کیا کر رہے ہو۔ ان کو "تم کمیونزم سکھا رہے ہو" اور

اَب خیال پر کوڑے برسنے شروع ہو گئے، حتیٰ کہ وہ بے ہوش زمین پر گر پڑا۔

ہمیں فوجی جیل کی تیسری منزل کے وارڈ ہی میں رکھا گیا تھا۔ ایک دفعہ میں نے دیکھا تھا کہ میرا ایک محافظ میرے سیل کی دیوار پر ہاتھ رگڑ کر صاف کر رہا تھا۔ یہ فرید واردا کا خون تھا۔ جو اس کے ہاتھوں پر لگا تھا۔

انہوں نے ہم سے کہا۔ اپنی قمیض اتار لو اور اپنے ہاتھ دیوار پر رکھو۔ جب پہلا کوڑا پڑا تو کلی نے اچھل کر ہمارے کندھے کی بوٹی اتار لی۔ جب دوسرا پڑا تو اس نے کمر پر کاٹا۔ اور تیسرے پر اس نے ٹانگوں پر کاٹا۔ اُسے یہ بھی شاید سکھایا گیا تھا کہ خون نکالے بغیر، بدن پر کس طرح کاٹتے ہیں۔ قیدیوں کے بدن، کتوں کے دانتوں کے نشانوں سے بھرے ہوئے تھے، کہ وہ سو بھی نہ سکیں اور کتوں سے کٹوانے کا مطلب بھی یہی تھا۔

"تم اپنے سیل کے کونے میں کھڑے ہو جاؤ" گارڈ مسلسل کھڑے رہنے کے لیے کہتا ہے۔ دوسری کوٹھریوں سے قیدیوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں، ان کے ساتھ ساتھ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی آتی ہیں۔

کوٹھری خالی ہے۔ فرنیچر نام کے لیے کھلا پیشاب دان ہے۔ ورنہ کوٹھری میں قیدی ہی بطور فرنیچر موجود ہے۔ محافظ کوٹھر میں سے جھانک کر کہتا ہے "کیا تم کھڑے ہو۔ اے کتیا کے بچے۔ بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔"

دوسری آواز "کیا تم بیٹھے ہو۔ اے کتیا کے بچے۔ کھڑے ہو جاؤ۔ کھڑے ہو جاؤ۔"

پھر آواز "کیا تم سو رہے ہو۔ اے کتیا کے بچے۔ اٹھو۔ اٹھ جاؤ۔"

ساری رات سو رہے ہو۔ تو جاگ جاؤ۔ بیٹھے ہو تو کھڑے ہو جاؤ۔ کھڑے ہو تو بیٹھ جاؤ آخر کو صبح کے پانچ بج جاتے ہیں۔ محافظ، ایک چیخ کی طرح کوٹھری کا دروازہ کھولتا ہے اور ایک رکابی کہ جس میں روٹی کا ٹکڑا پڑا ہوتا ہے سامنے لاڈالتا ہے کوٹھری کا دروازہ پھر بند ہو جاتا ہے۔

روٹی کے ٹکڑے کو سوکھے دانوں کے ساتھ منہ میں ٹھونس لو۔ پانی لو دو تین گھنٹے تک نہیں آئے گا۔ اگر محافظ کا موڈ خراب ہو تو شاید سارا دن ہی نہ آئے۔ پیشاب کی بو سے، ساری کوٹھری بھر جاتی ہے۔ تم کچھ کرنا چاہتے ہو کوٹھری کی دیواریں اور دروازہ۔ یہی فلسطینیوں کا جزیرہ ہے۔ پیلی اینٹوں سے بنے چار درخت، جن پر سفید پلستر کیا ہوا ہے اور آہنی دروازہ، آسمان جیسا۔ دیواروں پر بھی کچھ نام لکھے ہیں تصویریں چڑیاں اور جہاز بنے ہیں، قیدیوں کے آنے کی تاریخیں لکھی ہیں۔

ہم ساری دیواروں پر جلاوطنی کی تاریخ بھی ڈھونڈنا چاہی، وہ کہیں نہیں تھی۔ ہم شاید یہ بھول گئے تھے کہ ہم فوجی جیل میں تھے۔

ہم میں سے کچھ بھوکے رہ کر بالکل موت کے قریب تھے کہ تکالیف اور جاگتے رہنے کی اذیت نے زندگی کو ناقابلِ برداشت بنا دیا تھا۔

ساتویں دن انہوں نے پیشاب دان کو خالی کیا۔ ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ انہوں نے یہ کیوں کیا اور ہمیں باقاعدگی سے پانی دینا کیوں شروع کیا۔ اب ہمیں تین کپ روزانہ پانی مل رہا تھا۔ سبب یہ تھا کہ غازہ سے آئے ہوئے دو فلسطینی، حاجی محمد ابو درقہ، کہ ایک زمانے میں حشیش کاروبار کرتا تھا۔ مگر تائب ہو گیا تھا اور اس مذموم کاروبار کو چھوڑنے کی سزا، انٹیلی جنس اور سیکریٹ سروس کے لوگوں کے ہاتھوں بھگت رہا تھا۔ اس وقت جیل میں تھا۔ دوسرا شخص محمد ابو حسیرا تھا کہ جو غازہ کی بندرگاہ کا ناظم تھا، اس کی گرفتاری کا باعث چند افسروں اور تاجروں کی مشترکہ سمگلنگ کو بے نقاب کرنا تھا۔ ان دونوں لوگوں نے جیل کے وارڈ افسروں اور محافظوں کو رشوت دی حتیٰ کہ جیل کے وارڈن حمزہ بوسین کو بھی نوازا گیا کہ وہ اس تکلیف دہ سزا کو کم کر دے۔ اس صورتِ حال کو طوالت دینے کے لیے ابو درقہ اور حسیرا کو مزید رشوت بھی دینی پڑی۔

بنجامین، ایک یہودی تھا جو اسرائیل چھوڑ کر مصر آ گیا اور اُسے سراغ رسانی کے عملے نے گرفتار کر کے فوجی جیل میں بند کر دیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تو اہرامِ مصر دیکھنے آیا تھا اور انکی جگہ وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ فلسطینیوں کو کس طرح اذیتیں دی جا رہی ہیں۔

بنجامین کی ذمہ داری پانی تقسیم کرنا تھی۔ "پیو" وہ کہتا۔ سارا پانی پیو۔ وہ کہتا۔ سارا پانی پیو۔ پانی

پی کر اس کو شکر کے ساتھ کپ واپس دو تو وہ سر کنپے پر بڑا ممنون ہوتا۔ وہ کہتا "میں تو تمہاری طرح کا قیدی ہوں"۔ اور پھر وہ دوسرا کپ پانی کا دیتا، کہتا "منہ دھوؤ"۔ دو ہفتے میں پہلی دفعہ منہ دھونے کو پانی ملا تھا۔ اب ہجابین نے سگریٹ نکالا، سلگایا اور کہا لو پیو۔ تمباکو کی خوشبو سے ہوا بھر گئی۔ یوں لگا کہ جیسے ہوا سے بھی سگریٹ کے جلتے شعلے کو بچا کر رکھنا پڑ رہا ہو چاہے اُسے اپنی پلکوں میں چھپا کر ہی کیوں نہ بچانا پڑے۔ دو ہفتے بعد شعلے کی یہ دلہن ہماری کوٹھری میں داخل ہوئی تھی۔ پہلے ہی کش کے بعد لگا جیسے ہر چیز مرغولے میں ہے۔ دیواریں، دروازے اور بدن، ہر چیز لرز رہی تھی۔ دیوار پکڑ کر بیٹھا اور یوں لگا جیسے بادلوں کے امنڈتے دریا کے ایک کونے میں، میں موجود تھا۔ پابلو نرودا کے بقول، یوں لگا جیسے بجلی کو پیالے میں انڈیل کر، نوشِ جاں کر رہا ہوں۔

آخر کو تیرھویں دن، انہوں نے پیشاب دان، غسل خانے لیجا کر صاف کرنے کی اجازت ی۔ غسل خانہ کوئی ۲۰ میٹر کے فاصلے پر تھا۔ مگر ہم چل رہے تھے فوجی جیل میں آپ اپنے پیروں ہاتھوں اور آنکھوں کو بھول جاتے ہیں۔ کہ آپ کا نام آپ کی کوٹھری ہوتی ہے جو آپ کو یاد رکھنا چاہیئے۔

ہمارے ساتھ ایک مصری افسر بھی تھا جو پورٹ سعید پر لڑ چکا تھا۔ جب اس کا اسلحہ ختم ہوا تو اس نے کتابچے بانٹنے شروع کیے۔ انہوں نے اُسے گرفتار کر لیا۔ وہ شخص جو کتابچے کی اہمیت سے آگاہ ہو، وہ یقیناً کمیونسٹ ہوگا۔ ویسے بھی ان کے نزدیک کمیونزم، کاغذ سے وابستہ علم ہوتا ہے۔ جب اس نے ہمارے بارے میں سنا۔ اس نے ہم سے ملنے کی درخواست کی اور سارجنٹ میجر ابین نے اس کی درخواست قبول کر لی کہ بہرحال منیر حوانی ایک افسر تھے اور افسر کی درخواست بہرحال افسر مان ہی لیتا ہے۔ اٹھتیویں دن میں نے آسمان دیکھا۔ جی چاہا اسکو اپنی گرفت میں لے لوں۔ میں نے سورج کو دیکھا اور اپنا چہرہ، اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔ کہ یہی دفتر کی جانب دیکھے بنا، روز نکلتا اور غروب ہوتا تھا۔ محافظ نے ہمیں بوسینو کے دفتر کی جانب دھکیلتے ہوئے کہا۔ سورج کی طرف مت دیکھو آگے چلو... میں اپنے جوتوں میں پیر ڈال کر آگے چل پڑتا ہوں۔ ۳۸ دن کے بعد، بال بھی بڑھ جاتے ہیں مگر چہرہ بالکل نہیں بدلتا۔ ساری عمر کے مہاجر۔ اس چہرے اور بالوں کے ساتھ چل رہے تھے۔ اور جب تم اس چہرے کو بیگ میں اپنی قمیص، جرابوں اور کاغذوں کے ساتھ چھپانا چاہو تو وہ کہہ اُٹھتے ہیں "تم یا تو جاسوس ہو یا سمگلر"۔ میں ہر وقت اپنے چہرے سے چھپتا پھرتا ہوں۔ ان کے معیار کے مطابق، میں ایک غیر ملکی جاسوس تھا، اور ریڈیو کی اطلاع کے مطابق، میں گرفتار ہی نہیں ہوا تھا۔ ریڈیو کی اطلاع کے مطابق تو میری ماں، باپ اور بھائی کو جلا وطن نہیں کیا گیا تھا۔ ریڈیو تو یہ بھی کہتا ہے کہ میری بیوی کو جیل میں گھسیٹا نہیں گیا۔

مہبا کی ماں کی ایک دوست کی کوششوں کے باعث، مہبا کو ہم سے ملنے کی اجازت مل گئی تھی۔ وہ ہمیں پہچان بھی نہیں سکتی تھی کہ "ہم لوگ اس قدر کمزور ہو گئے تھے۔ مجھے تو مہبا ہی سے پتہ چلا کہ میرے گھر والے کویت سے نکالے گئے تو پھر وہ اردن چلے گئے ہیں۔ یہ بھی پتہ چلا کہ میرے والد، اس خاتون سے رابطہ قائم رکھے ہوئے تھے، اور یہ بھی کہ وہ قاہرہ، مجھ سے ملنے کے لیے آ رہے تھے۔ انہی البتہ اس وقت تک یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں تھے، کہ ہمارے دشمن، یہ تو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے کہ گزشتہ دو ماہ سے ہم گرفتار ہو کر، فوجی جیل ہی میں نظر بند تھے۔

ہمیں یہ دیکھ کر اور بھی خوشی ہوئی کہ مہبا ہمارے لیے سگریٹ لائی تھی۔ سگرٹوں کے ساتھ ماچسوں کا ڈبہ بھی تھا۔ ہم نے کفایت شعاری دکھائی اور ہر تیلی کی دو دو تیلیاں بنا ڈالیں۔ جب میں نے افسر انچارج سے سگرٹ تقسیم کرنے کی اجازت چاہی تو اس نے اجازت بھی دیدی۔ پہلی کوٹھری خلیل اویدا کی تھی۔ اس نے اڑتیس دن سے سگرٹ نہیں پیا تھا۔ یہ اجازت ہمارے لیے بہت سکون کی منزل تھی۔ کچھ دن کے بعد، افسر خلیل اویدا کو مسٹر خلیل کہہ کر پکارنا شروع کر دیا تھا، کتے، اب ہمارے پا نہیں آتے تھے

ہم میں سے کچھ نے تو سوچنا شروع کر دیا کہ شاید ہم آزاد ہونے والے ہیں۔ مگر اتنے میں غازہ سے قیدیوں کا ایک اور جتھا پہنچ گیا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے انٹیلیجنس اور سیگریٹ سروس کے لوگ، عوام کے کانوں میں بور رہے تھے۔

آخر کو میرا باپ، مجھ سے ملنے آیا۔ اور تمام اقتدارِ زمانہ کے باوجود، وہ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ عظیم مہاجر کہ پائے استقلال، سلامت اور جھکنے کو تیار نہیں۔

میرے باپ نے مجھے بتایا کہ کس طرح ہمیں کویت سے پہلے جہاز پہ سوار کر کے، روانہ کیا گیا مگر کہاں کے لیے۔ یہ ہمارا مسئلہ تھا۔

میرے سارے گھر والوں کے کاغذات غازہ میں تیار ہوئے تھے۔ مگر اب سب کے سب میعاد ختم ہونے کے باعث بیکار ہو چکے تھے۔ مگر کسی چیز کی پرواہ کیے بغیر، یعنی بغیر پاسپورٹ انہوں نے میرے خاندان کو جہاز پہ سوار کرا دیا اور غازہ میں آنے سے منع بھی کر دیا۔ وہ قلندیہ ایئرپورٹ پر بے یار و مددگار پڑے تھے، خوش قسمتی سے اسی جہاز میں کچھ اردنی اور فلسطینی بھی تھے کہ جنہیں اپنے کمیونسٹ اور حب الوطنی کے جذبے کے تحت ملک بدر کیا گیا تھا اور وہ میرے گھر والوں کو ساتھ لے گئے تھے خدا ان پر اپنی رحمت سدا قائم رکھے۔

جب میں قاہرہ پہنچا تو مجھے فوراً شہر چھوڑ دینے کا حکم ملا۔ میں نے پھر بھی سات دن گزارے۔ حتیٰ کہ انہوں نے مجھے صرف آدھے گھنٹے کے لیے ملنے کی اجازت دی تم یہ سن کر فکر نہ کرنا۔ میں سکندریہ سے بیروت تک بحری جہاز سے سفر کر لوں گا کہ تمہاری ماں اور تمہارے بھائی وہاں ہیں۔ اور پھر یہ کون پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ ہمیں شہر بدر کیا گیا ہو۔

قیدی، غازہ سے آنے والی خبر سننے کے لیے میرے گرد جمع ہو گئے اور میں نے اپنی کویت سے بیدخل کیے جانے والوں کے بارے میں بتایا۔

ہم سگرٹ پیتے رہے۔ اب ہم ذرا باہر بھی نکلتے تھے، لکی اب ہمارا عادی ہو گیا تھا۔ اور کتیا، عنایت، حاملہ ہو چکی تھی۔

ان لوگوں نے مجھے مہبا سے دوسرے وارڈ میں ملنے کی اجازت دیدی تھی۔ کبھی کبھی ہم کھانا بھی اکٹھے کھا لیتے تھے۔ ہم نے ایک کوٹھری کو باورچی خانہ بنا لیا تھا — عبدالمجید خیال ہمارا انچارج بن گیا تھا، ہماری زندگی کے معمولات بالکل ایک دوسرے میں مدغم تھے۔ یعنی سگرٹ اور منی آرڈر تک ہم آپس میں بانٹ لیا کرتے تھے۔

محافظ میرے خط بھی مہبا کو پہنچا دیتا تھا کہ جیل میں محافظ بھی ڈاکیہ ہوتا ہے۔ شیشے کی بوتل سے ایک خط اس نے مہبا کو یہی نام دیا تھا۔

"کاہے کی بوتل؟..."

اور وہ ہنس کے جواب دیتا "چنبیلی کی"

(باقی صفحہ ۳۸۴ پر)

مستنصر حسین تارڑ

خانہ بدوش

دھماکہ اتنا شدید تھا کہ میں بے اختیار لڑھکتا ہوا بستر سے فرش پر منتقل ہوگیا۔ اسی لمحے کھڑکی کا ایک بڑا شیشہ فریم سے جدا ہوکر قالین پر آگرا۔ میں سانس روکے سفید چادر میں ایک ممی کی طرح لیٹا پڑا رہا۔ باہر رات تھی۔ کمرے کے ٹھہرے ہوئے اندھیرے میں حرکت ہوئی۔۔۔ احمد جو میری طرح فرش پر پھینک دیا گیا تھا۔ دھیرے سے اٹھا اور نیند میں چلنے والے ایک بچے کی طرح ہاتھ پھیلائے پھر بستر پہ دراز ہوگیا۔۔۔

ایک اور زوردار دھماکہ ہوا، کھڑکی کے بقیہ شیشے کانپے۔

"احمد"

"کیا ہے؟" وہ تکیے میں سے بڑبڑایا۔

"یہ دھماکے کیسے ہیں؟"

"سو جاؤ۔ کچھ بھی نہیں"

"لیکن کیسے سو جاؤں؟" میں نے جھلا کر کہا "باہر پتہ نہیں کیا کیا چل رہا ہے"

"ہینڈ گرینڈ پھٹے ہیں۔ شائد اسی عمارت کے کسی حصے میں۔۔۔ سو جاؤ۔ سو جاؤ"

احمد کی بے اعتنائی میرے لیے ناقابل فہم تھی۔ باہر جو کچھ بھی پھٹ رہا ہے اگر کھڑکی کے راستے اندر آگرے اور کمرے میں پھٹ جائے تو! مگر وہ دودھ سے سیراب ہوکر سونے والے بچے کی طرح پاؤں پسارے چھوٹے چھوٹے خراٹے لے رہا تھا۔ میں بدن پر لپٹی ہوئی چادر سمیت لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور رینگتا ہوا بستر پر لیٹ گیا۔۔۔ تھوڑی دیر بعد مشین گن کا ایک برسٹ فائر ہوا۔۔۔ میں ایک جھنجھناتے ہوئے قہقہے کے انتظار میں رہا مگر وہ مجھ تک نہ پہنچا۔ صرف دوڑتے ہوئے قدم اور آوازوں کا ملا جلا شور۔۔۔ اس فائر کا جواب کہیں دور سے آیا اور پھر باقاعدہ تبادلہ شروع ہوگیا۔ فائرنگ کی آواز بے حد معصوم اور جعلی لگ رہی تھی۔ جیسے کوئی کھوپڑی کنکنا رہی ہے یا ٹین کی چھت پر کنکر برس رہے ہیں۔

اس دوران ایک اور دھماکہ سنائی دیا۔ کانوں کے قریب شائد ہماری کھڑکی کے عین نیچے فائرنگ اتنی گھنی اور شدید ہو رہی تھی کہ کسی ایک مشین گن کا آہنی بہاؤ علیحدہ نہیں ہو پاتا تھا۔۔۔ یکدم میرے ذہن میں یہ خدشہ ابھرا کہ ہو سکتا ہے حملہ آور فلانجی ہوں اور پچھلے اپریل کی طرح آج بھی اس ہوٹل میں گھس کر مہمان حضرات کو شہید وغیرہ کر دیں۔

"احمد" میری آواز میں خطرے کا گھگھیاتا ہوا سائرن تھا

"سو جاؤ" ایک انتہائی بیزار آواز آئی۔

"احمد کیا تم جانتے ہو کہ فلانجیوں نے پچھلے اپریل اس ہوٹل میں مقیم چند مہمانوں کو ہلاک کر ڈالا تھا؟"

"ہاں"

"تو پھر؟"

"تو پھر کیا۔۔۔ ہوتا ہی رہتا ہے سو جاؤ"

میں بستر سے اٹھا اور جھکا ہوا احمد کے قریب چلا گیا

"اگر کسی نے کھڑکی میں سے ہینڈ گرینڈ پھینک دیا تو؟"

احمد مجبوراً اٹھ بیٹھا "تم خوفزدہ ہو؟"

"بری طرح"

"ہاں انسان ہتھیار کے بغیر بے سہارا محسوس کرتا ہے" وہ جمائیاں لیتا ہوا بستر سے اُترا۔ اپنا سوٹ کیس گھسیٹ کر باہر نکالا اور استری شدہ قمیضوں اور بنیانوں کی تہ میں ہاتھ ڈال کر ایک پستول نکالا اور مجھے تھما دیا "بھرا ہوا ہے۔ دروازے والی دیوار کے کونے میں بیٹھ جاؤ اور اگر دروازہ یکدم کھلے تو۔۔۔ شوٹ"

"شوٹ؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

وہ شائد اندھیرے میں مسکرایا ہوگا۔

میں کونے میں جا کر ایڑیوں کے بل بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد احساس ہوا کہ میں نے پستول کو ویسے ہی تھام رکھا ہے۔ لبلبی پر انگلی نہیں جمائی اور نہ ہی نالی کا رخ دروازے کی جانب کیا ہے۔ چنانچہ بڑی مشکل سے لبلبی تلاش کر کے انگلی لپیٹی اور اسے سیدھا کر دیا۔

"اب تو خوفزدہ نہیں ہو؟

"اب بھی ہوں ۔۔۔ دروازے کا تو بندوبست ہوگیا مگر کھڑکی میں سے آنے والے ہینڈ گرنیڈ کا کیا ہوگا؟"

"اس کے بارے میں کچھ نہیں ہو سکتا۔۔۔" اس نے پاؤں بستر پر رکھے اور لیٹ گیا۔

"کھڑکی بند تو کی جا سکتی ہے نا"

"شیشہ کی ہے، فرق نہیں پڑے گا" وہ اونگھنے لگا۔ موت کا ایک دن معین ہے پر اس کا ایمان غیر متزلزل دکھائی دیتا تھا۔

باہر متواتر فائرنگ ہو رہی تھی۔ چیزیں ٹوٹ رہی تھیں میں نے یوں کونے میں چپکے ہاتھ میں پستول تھامے اپنے آپ کو کچھ کچھ احمق محسوس کیا "تمہیں اتنے شور میں نیند آجاتی ہے؟"

"ہوں" وہ بڑبڑایا "کوسنے شور میں" اور آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا "ہاں یہ۔۔۔" اس نے سستی سے پھر اپنا سوٹ کیس کھولا ایک اور پستول نکالا اور کمرے کے دوسرے کونے میں جا بیٹھا۔

"اب خوش ہو؟"

میری آنکھیں دروازے پر اتنی شدت سے چپکی ہوئی تھیں کہ پپوٹے دکھ رہے تھے۔ کواڑ ہلتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ لبلبی پر لپٹی انگلی پسینے سے تر تھی۔ پھسلتی ہوئی باہر سے آنے والی فائرنگ کی آواز جتنی شدت اختیار کرتی اسی حساب سے پستول پر میری گرفت سخت تر ہو جاتی جیسے میری تم انگلیوں میں گرم ہوتی یہ دھات میرے جسم کو بلٹ پروف بنا دے گی۔ یہ طلسمان ہے جو مجھے محفوظ رکھے گا۔ میں نے ایک لحظ کے لیے دروازے سے نظریں ہٹائیں اور پستول کی نالی کو دیکھا جو میری ناک سے چھ انچ کے فاصلے پر خفیف سی لرز رہی تھی اور پھر دروازے پر آنکھیں چپکا دیں۔۔۔۔ میں نے پھر پستول کی طرف دیکھا۔۔۔ میں یہاں کیا کر رہا ہوں؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں نے اس گھڑے سے پیاس کیوں بجھائی جس میں دیوانگی سیاحت کے پانی تھے۔ کھوہو کے بیل کی زندگی کتنی خوبصورت تھی۔ ایک ڈگر پر شب و روز ایک روٹین کی تابع برس ہا برس گذر جاتے ہیں اور وہی چہرے وہی ایک ناشتہ کی دکان، چھ آنے پا، یوسف اوئے یوسف۔۔۔ پھر واپسی پر ٹیلی ویژن کے سامنے بت بنے بیٹھے رہنا، لیکن اپنے گھر میں۔۔۔ پرسکون، دھماکوں سے پاک۔ ٹھیک ہے اس زندگی

کا حساب نہیں تھا، مگر انسان متواتر زندہ تو رہتا ہے۔ کبھی اس کی کھڑکی تلے گرینیڈ نہیں پھٹتے، مشین گنوں کے برسٹ نہیں چلتے اور وہ ایک بھرے ہوئے پستول کو تھامے خون میں توجہ اور سکوت کی جتنی قوت ہوتی ہے۔ اسے آنکھوں کے راستے دروازے پر منتقل کرتا ہوا اگلے سانسوں کی بے یقینی میں تو سانس نہیں لیتا.... متواتر تو زندہ تو رہتا ہے۔

آج رات دس بجے ترک جہاز اکڈونیز بیروت کی بندرگاہ سے لنگر اٹھا رہا تھا اور اس کا میں متوقع مسافر تھا...... پچھلے چند روز زیادہ تر اسی چھت کی نیم عافیت میں گزرے احمد ایک ہمدرد اور اپنے پتھر کے چہرے کے نیچے ایک سیاہ حس مزاح رکھنے والا دوست اور ساتھی ثابت ہوا تھا۔ میں صرف خوراک خریدنے کے لیے باہر جاتا یا کبھی کبھار ہوٹل کی پشت پر واقع ایک دیسی قسم کے قہوہ خانے میں چلا جاتا جس کا قہوہ شاید کسی سکون آور بوٹی سے کشید کیا جاتا تھا کہ میرے اعصابی تناؤ کو یکدم نارمل کر دیتا اور حقے کے طویل کش مجھے آس پاس سے لمحاتی طور پر بے خبر کر دیتے۔ ایک دو مرتبہ الحمرا کی طرف بھی گیا۔ نصف سے زیادہ دکانیں بند تھیں اور سی تھرو خواتین یکسر غائب ہو چکی تھیں۔ البتہ ہنہناتے ہوئے قہقہے والا لبنانی کبھی مایوس نہ کرتا، وقت کی پابندی کرتا اور ہر صبح شاید ہماری ہی تفریح کی خاطر دو چار برسٹ ضرور چلاتا اور ہنس ہنس کر دوہرا ہو جاتا...... ہمیں اس کی آمد کا انتظار رہتا اور ایک صبح اس کے اپنے فائر کو سن کر میں نے اپنی گھڑی درست کی چار بج کر دس منٹ تقریباً ایک گھنٹے سے ہینڈ گرینیڈ کا کوئی دھماکہ نہیں ہوا تھا البتہ فائیرنگ وقفوں سے ہو رہی تھی.. اور آج رات دس بجے بیروت کی بندرگاہ سے ترک جہاز اکڈینیز کو رواں ہونا تھا۔ اذیتوں سے سکون اور رعنائیوں کی طرف..... صبح کے آثار کے ساتھ جیسے متحارب قوتوں کے ہاتھ تھکنے لگے اور چھ بجے کے قریب فائرنگ بالکل ختم ہو گئی..... تھوڑی دیر بعد قدموں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ بازار میں حرکت پیدا ہوئی اور پھر وہ روزمرہ کی آوازوں سے بھر گیا...... احمد منہ پر ہتھیلی رکھے تھکاوٹوں کو روکتا اٹھا..... میں نے خالی ہاتھ سے پستول کی نالی تھامی اور دستے پر سمنٹ ہوئی انگلیوں سے بمشکل علیحدہ کیا۔

احمد نے پستول سوٹ کیس میں رکھے اور اپنے نقشے نکال کر بیٹھ گیا "یہ آوازیں الگ نہیں ہیں خوانچہ فروشوں کی دہائی، ٹریفک کا شور، بچوں کی آوازیں، فائرنگ اور دھماکے، یہ سب ایک ہی بہاؤ میں ہمارے کانوں تک پہنچی ہیں۔ اگر ہم ہر دھماکے پر چوکنے ہو کر پستول نکالتے رہے تو زندگی معطل ہو جائے۔"

"اور اگر فلانجی سچ مچ ہوٹل میں گھس آئے یا کھڑکی کے راستے ہینڈ گرینیڈ پھینک دیا جاتا تو؟"

وہ ہنسا "تو پھر ہم یقیناً مارے جاتے ویسے بھی پستول تھام کر نیند خراب کرنے کا ہمیں کچھ فائدہ نہ ہوتا..... اگر فلانجی آ ہی جاتے تو وہ دروازہ توڑ کر اپنے ہینڈ گرینیڈ اندر پھینکتے پھر داخل ہوتے اور ظاہر ہے تم اندر ہی رہتے مگر قدرے بکھرے ہوئے...... اور اگر کھڑکی کے راستے ہینڈ گرینیڈ ہمارے قالین پر آ گرتا تو کیا تم اسے پستول سے شوٹ کر دیتے؟... انسان کو ذہنی طور پر دفاع کے لیے تیار رہنا چاہیے ورنہ جس گولی کو تمہارے لیے آنا ہے وہ اپنا تعارف کروا کے تمہارے بدن میں داخل نہیں ہو گی"

میں نے فرش پر سے ٹوٹے ہوئے شیشے چنے اور ٹوکری میں پھینک دیئے۔ بالکونی پر آیا تو نیچے بازار میں زندگی ایک بے خوف روانی سے حرکت کر رہی تھی۔ جیسے چند لمحے بیشتر کسی نے سڑک کے بیچ ایک سٹیریو ڈیک رکھ کر لوگوں کو دھماکوں اور گولیوں کی آوازیں سنائیں اور پھر کیسٹ ختم ہونے پر چلا گیا۔ کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

ناشتے کے بعد میں سروس ٹیکسی کے ذریعے سفارت پہنچا تو میر صاحب اپنے کمرے میں موجود نہ تھے۔ دو گھنٹوں کے بعد جب وہ آئے تو قدرے پریشان آئے۔ مجھے دیکھ کر مزید پریشان ہو گئے "آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"بیروت چھوڑنے سے پیشتر خدا حافظ کہنے آیا تھا"

"خدا حافظ" انہوں نے شتابی سے ہاتھ آگے کر دیا "آپ ہوٹل سے فون پر ہی بات کر لیتے تو بہتر تھا...... مگر آپ یہاں تک آ کیسے گئے؟..."

"سروس ٹیکسی سے"

"آپ کو معلوم ہے کہ صولح سکوئر کے قریب آج صبح کیا ہوا ہے؟"

"جو کچھ ہوا ہے وہ میری کھڑکی کے عین نیچے ہوا ہے مگر اب تو حالات نارمل تھے۔"

"فی الحال" میر صاحب کچھ زیادہ ہی فکرمند تھے۔

"آپ کا جہاز کتنے بجے چل رہا ہے؟"

"رات دس بجے"

"اور بندرگاہ سے چلے گا؟"

"ظاہر ہے"

"مگر بندرگاہ تو......" انہوں نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایک کلرک اندر داخل ہوا "عزیز کو بلاؤ"

عزیز آ گیا۔ ڈھلتی عمر کا ایک گورا چٹا جھکا جھکا سا شخص۔

"عزیز ویسے تو ہمارے ہاں ڈرائیور ہے مگر بیروت شہر کو اس سے بہتر کوئی نہیں جانتا"

گویا یہ شخص بیروت کے سفارت خانے کا محمد علی تھا۔

میر صاحب نے میرا تعارف کروایا کہ یہ میرے دوست ہیں۔ آج رات دس بجے ان کا جہاز چلے گا۔ اور بندرگاہ سے چلے گا...... تم کیا کہتے ہو؟

"یہ نہیں جا سکتے" عزیز نے سستی سے کہا۔

"آپ نہیں جا سکتے" میر صاحب نے فوراً تائید کی۔

"کیوں؟"

"جہاز میں سوار ہونے کے لیے آپ کو بندرگاہ پہنچنا ہو گا۔ اور وہاں آپ پہنچ نہیں سکتے کیونکہ آج صبح بیروت پولیس نے ریڈیو پر جن خطرناک علاقوں کا اعلان کیا ہے بندرگاہ ان میں سر فہرست ہے"

"عزیز صاحب اگر میں اپنی بالکونی سے جھانکوں تو بندرگاہ نظر آ جاتی ہے...... میرے خیال میں تو......"

"بندرگاہ تک پہنچنے کے لیے آپ کو اس علاقے سے گزرنا ہو گا جہاں حرکت کرتی ہوئی ہر شے پر فائرنگ ہو رہی ہے..... مجھے افسوس ہے کہ آپ اس جہاز پر سوار نہیں ہو سکتے"

"اگر میں اس جہاز پر سوار نہیں ہوا عزیز صاحب تو ٹکٹ کے ایک سو دو ڈالر ضائع ہوتے ہیں"

"اور اگر آپ سوار ہونے کی کوشش کرتے ہیں......" عزیز اسی لاپرواہ سستی سے بولا "تو

آپ کی زندگی ضائع ہوتی ہے۔"

میں نے پچھلے پانچ روز اس آس میں گذارے تھے کہ بالآخر میں زندہ عذاب میں مبتلا اس شہر سے نکل جاؤں گا۔ اس سے پیشتر کہ وہ زمین بھی گرم ہو جائے جس پر میں کھڑا تھا۔ اور اب میرے سامنے ایک آہنی دروازہ تھا۔ اس کو ہاتھ لگا کر کھولنا چاہتا ہوں تو ہو سکتا ہے اس میں بجلی کی لہر دوڑ رہی ہو۔ اور اگر نہیں کھولتا تو شائد بجلی کی وہی لہر دھیرے دھیرے اس زمین میں بھی آ جائے جس پر میں کھڑا تھا۔ نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے۔

"میں کوشش کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے اپنے آپ کو یقین دلانے کے لیے سر جھٹکا "میں پہنچ جاؤں گا۔"

عزیز نے فون اٹھا کر بیروت پولیس کے ہنگامی دفتر سے بات کی اور پھر شہر کے ایک نقشے پر سرخ نشان لگا کر میرے حوالے کر دیا۔ "میں نے اس پر بندرگاہ تک جانے کے لیے ایک روٹ بنایا ہے۔ جو پولیس کے مطابق نسبتاً کم خطرناک ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور سے کہئے گا کہ صرف اسی راستے پر چلے اور اللہ آپ کی مدد کرے۔"

"خدا حافظ" میر صاحب نے جلدی سے ہاتھ آگے کر دیا۔ ان کے چہرے پر میری آخری رسومات تھیں۔

ٹیکسی کے لیے الحمرا پہنچا تو احساس ہوا کہ عزیز کی اطلاعات درست تھیں۔ لوگ ہراساں خرگوشوں کی طرح چوکنے ہو رہے تھے۔ جھانک جھانک کر چل رہے تھے۔ کوئی گلی آئی تو رُک کے جھانک کر اطمینان کیا اور پھر جلدی سے عبور کر گئے۔ ان کے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ دکانوں کے شٹر گرے ہوئے تھے...... صولح سکوئر میں بھی یہی کیفیت تھی۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے احمد کو پوری تفصیل بتائی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اٹھا اور بالکونی میں جا کر دو تین ہاتھ پر بندرگاہ کی طرف دیکھا — واپس آیا اور بستر پر بیٹھ گیا "حالات چاہے کتنے ہی خطرناک کیوں نہ ہوں سڑک پر سے گذرنے والی ہر ٹیکسی اور ہر شخص پر فائر نہیں ہوتا۔ تمہارا جہاز کتنے بجے چلنا ہے؟"

"رات دس بجے"

"ہوں" اس نے چند لمحے قالین کو گھورنے میں گذارے اور پھر سر اٹھا کر بولا "یہ ضروری تو نہیں کہ تم رات کو ہی یہاں سے نکلو جہاز تو اس وقت بھی بندرگاہ میں کھڑا ہوگا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد فوراً چلے جاؤ۔"

"اور اگر جہاز وہاں موجود نہ ہوا تو؟"

"تو تم بندرگاہ کے اندر انتظار کر سکتے ہو۔ وہاں نسبتاً محفوظ رہو گے۔"

تین بجے ہم ہوٹل کی سیڑھیوں سے نیچے اُترے۔ میں رک سیک کاندھے پر رکھے اور احمد جیکٹ کی جیب میں پستول رکھے۔

ٹیکسی رُکتی۔ احمد "مینا" کا لفظ ادا کرتا اور ڈرائیور ہماری سادہ لوحی پر مسکراتا چلا جاتا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد ایک فلسطینی ٹیکسی ڈرائیور رُکا۔ احمد خاصی دیر تک اس کے ساتھ گفتگو کرتا رہا۔

"میں ساتھ نہ جاؤں تو تمہارے لیے بہتر ہے" احمد نے ایک پُرجوش معانقہ کیا "میں... فلسطینی لگتا ہوں اور ہوں بھی۔ تم اکیلے بیٹھو گے تو زیادہ محفوظ رہو گے۔"

"کل صبح اس ہنہناتے ہوئے گھوڑے کو میرا اسلام کہنا جو ہر صبح کھڑکی کے نیچے مشین چلانے آ جاتا ہے۔"

"میں صرف تمہاری خاطر ٹھہرا ہوا تھا۔ آج میں چلا جاؤں گا۔"

"کہاں"

"کہیں۔ واپسی کے دن کو قریب لانے کے لیے۔"

پتھر چہرے سے ہونٹ علیحدہ ہو کر صرف میرے لیے مسکرائے۔

ٹیکسی چلنے لگی تو وہ کھڑکی پر جھکا "اسے پانچ ڈالر ادا کر دینا۔"

"پانچ ڈالر؟ میں نے حیران ہو کر ڈرائیور سے پوچھا "ایک کلومیٹر کے لیے پانچ ڈالر؟" اس نے جواب دینے کی بجائے ایک ناراض نظر سے دیکھا کہ بھئی بڑے ناشکرے ہو۔

روڈی کا پوچین تک ٹیکسی ہموار رفتار سے چلتی رہی ٹریفک بھی تھی لوگ بھی نظر آ رہے تھے۔

ایک چوک آیا آگے کا سماں بالکل مختلف تھا۔ ڈرائیور نے بریک پر پاؤں رکھا اور گردن گھما کر کہنے لگا۔ "ہم سڑک کے دائیں ہاتھ پر چلیں گے اس لیے بائیں کونے میں بیٹھ جاؤ......" میں نے اس کی ہدایات پر عمل کیا اور رک سیک کو گھٹنوں پر رکھ کر کونے میں دبک گیا۔

ٹیکسی پھر چلی۔ چوک کے آگے جیسے کوئی نیا شہر شروع ہو گیا ہو۔ سرحد پار کوئی نئی آب و ہوا تھی.... ٹریفک نہ ہونے کے برابر۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے پیچھے ایک آدھ سر جھانکتا ہوا اور خاموشی۔ ٹیکسی دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ شائد دس کلومیٹر کی رفتار سے.... کیونکہ تیز رفتار ٹیکسی پر ہمیشہ فائر ہوتا ہے۔ انہیں شک ہوتا ہے کہ اس میں سوار افراد گرنیڈ پھینک کر فرار ہونا چاہتے ہیں۔ میں کبھی کبھی کچھوے کی طرح گردن اونچی کر کے دائیں بائیں دیکھ لیتا...... ڈرائیور اپنے سامنے نظریں ساکت کئے ہوئے ایک ہموار اور سست رفتار سے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ پھر وہی ہوا جس کا انتظار تھا...... یک برسٹ فائر ہونے کی آواز گونجی۔ ڈرائیور نے ایکسیلیٹر اس شدت سے دبایا جیسے وہ پاؤں تلے آئے کسی موذی سانپ کو کچل دینا چاہتا ہو۔ میں دبکنے کی بجائے اتنا ہراساں ہوا کہ پہلے تو گردن اٹھا کر مزے سے باہر دیکھنے لگا اور پھر فوراً ہی اپنے آپ کو نشست سے گرا کر رک سیک اپنے جسم پر گھسیٹ لیا۔ ٹیکسی کا انجن دھاڑتا ہوا شائد سوا سو کلومیٹر کی رفتار پر جا رہا تھا۔ ڈرائیور بھی شائد سیٹ کے نیچے بیٹھا ہاتھ سٹیئرنگ پر رکھے ڈرائیو کرتا چلا جا رہا تھا۔ شائد دوسرے ہی لمحے ٹیکسی ایک شدید دھچکے سے رُکی۔ میں باہر کودنے کو تھا کہ ڈرائیور نے دروازہ کھول دیا۔

"آ جاؤ" وہ ہنسنے لگا "ہم بندرگاہ میں پہنچ چکے ہیں۔"

میں باہر آیا تو وہ ٹیکسی کے گرد گھوم کر معائنہ کرنے لگا۔ رکا، جھکا اور دو انگلیاں دو صاف ستھرے سوراخوں میں ڈال دیں۔ "میرا خیال ہے امریکی ساخت کی مشین گن تھی۔ سوراخوں کا سائز تو وہی ہے۔"

میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ گولیوں کے چھید میری طرف کے دروازے میں تھے۔

کرایا ادا کیا تو وہ پھر سوراخوں کا جائزہ لینے لگا "تم کہتے تھے کہ پانچ ڈالر بہت ہیں۔ ان سوراخوں کی مرمت پر پورے پانچ ڈالر خرچ ہوں گے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور اپنے فقرے سے محظوظ ہوتا ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

ٹیکسی پھاٹک سے باہر نکل کر بیروت شہر کی طرف گئی تو میں نے پہلی مرتبہ بندرگاہ کو دیکھا جہاز "ایکڈنیز" ڈاک میں کھڑا تھا۔ ترکی اور لبنان کے جھنڈے مستولوں کے ساتھ لپٹے لہرا رہے تھے...... آزادی۔

دائیں ہاتھ پر کسٹم ہال تھا۔ میں اندر گیا۔ خالی، خالی، بے آباد اور بھاں بھاں کرتا ہوا۔ ایک کمرے میں سے ٹائپ مشین کی آواز آ رہی تھی۔ دروازہ کھولا۔ اندر ایک کسٹم افسر ٹائپ مشین پر جھکا ہوا تھا۔ آہٹ سن کر وہ چوکنا ہو گیا۔ مجھے دیکھا اور غصے سے بولا "کیا چاہتے ہو؟"

"میرا سامان چیک کر لیجئے۔ میں لبنان چھوڑ رہا ہوں"

اس نے ٹھٹک کر مشین سے انگلیاں اٹھا لیں کہ یہ سیاح کہہ کیا رہا ہے اور پھر انتہائی بیچارگی سے کہنے لگا۔ "بابا جاؤ جاؤ۔ کوئی چیکنگ نہیں"

اکڈنیز کی خالی سیڑھی میرا منتظر ر[...]تھی۔ میں رُک سیک اٹھائے بندرگاہ کے خالی میدا[ن]میں سیٹیاں بجاتا اس کی طرف چلنے لگا۔

ایک لبنان پولیس افسر کرسی [...] سجائے اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں قریب سے گذرا تو اس نے پوچھا "پاسپورٹ؟" میں نے پاسپورٹ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اس نے تمام اوراق پلٹے اور پھر اپنے آپ میں مگن ہوتے ہوئے کہا "تم لبنان نہیں چھوڑ سکتے"

گرم چیونٹیوں کا ایک لشکر میرے مساموں میں رینگنے لگا "کیوں؟"

"تمہارے پاس لبنان پولیس کا اجازت نامہ نہیں ہے"

وہ اپنے اخبار میں محو ہو گیا۔

"لیکن میرے پاس لبنان کا ویزا ہے اور میں لبنان چھوڑ رہا ہوں۔ اس میں داخل نہیں ہو رہا"

"تم اس وقت تک لبنان نہیں چھوڑ سکتے جب تک تمہارے پاس پولیس کا "خروج" اجازت نامہ نہ ہو"

میرا جی چاہا کہ میں اپنا سامان یہیں پھینک کر سرپٹ بھاگتا ہوا۔ جہاز میں جا گھسوں اور ترک بھائیوں سے سیاسی پناہ طلب کر لوں ...... لیکن یہ لبنان بھائی پستول سے مسلح تھا اور خوفزدہ خرگوش کو شکار کرنا کتنا آسان ہوتا ہے ...... چاہے وہ سرپٹ ہی کیوں نہ بھاگ رہا ہو۔

لبنان پولیس کا دفتر ظاہر ہے شہر بیروت کے کسی حصے میں ہوگا۔ اور اگر میں وہاں تک پہنچ بھی جاؤں تو اجازت نامہ حاصل کرنے میں ایک دو روز تو لگیں گے۔ چنانچہ خدا حافظ اکڈنیز اور ہیلو مائی ڈیر سٹی آف بیروت میں تمہارے پاس واپس آتا ہوں۔

"یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ جاؤ جا کے اجازت نامہ لے کر آؤ" وہ میری موجودگی سے بیزار ہو گیا "تم اس کے بغیر جہاز پر سوار نہیں ہو سکتے"

"کیا آپ از راہِ مہربانی بتا سکتے ہیں کہ یہ اجازت نامہ کہاں سے دستیاب ہوتا ہے؟" میں دنیا جہان سے بیزار ہو چکا تھا۔

"بندرگاہ کے پھاٹک سے باہر، دائیں ہاتھ پر رووی پورٹ ہے۔ تقریباً دو سو میٹر کے فاصلے پر پولیس کا دفتر ہے وہاں ہے"

بندرگاہ سے باہر اس علاقے میں جہاں مہربان ڈرائیور کی ٹیکسی چھیدوں سے نوازی گئی تھی۔ میں نے سوچا آہستہ آہستہ چلنا خطرناک ثابت ہو چکا ہے اس لیے کیوں نہ سامان یہاں رکھ کر ایک اولمپک طرز کی دوڑ لگا کر پولیس کے دفتر پہنچ جایا جائے۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" اس نے مجھے رُک سیک کندھے سے اتار کر زمین پر رکھتے دیکھ لیا۔

"سامان رکھ رہا ہوں، ذرا اجازت نامہ لے آؤں"

"لے جاؤ لے جاؤ" وہ رُک سیک کو اپنی چھڑی سے دھکیلتا ہوا بولا "اگر تم ادھر راستے میں مارے جاؤ تو میں اس سامان کے بارے میں خواہ مخواہ وضاحتیں پیش کرتا رہوں گا۔"

بندرگاہ کے پھاٹک کے باہر وہی ویرانی تھی۔ جو اندر تھی مگر اس میں گھنی بکھرتی ہوئی سبز گھاس کا خوف تھا۔ جس میں سانپ رینگتے ہیں۔

میں نے دائیں ہاتھ پر جھانکا، دو سو میٹر کے فاصلے پر ایک عمارت کے ماتھے میں سے نکلتے ہوئے بانس پر لبنان کا پرچم لٹک رہا تھا۔ لبنان پولیس کا دفتر...... دو سو میٹر...... جو مجھے پیدل طے کرنا تھا۔

میں نے دانت بھینچے، رُک سیک کے سٹریپ میں انگوٹھے ڈالے اور سر جھکا کر سڑک کے عین درمیان میں آہستہ آہستہ چلنے لگا...... مجھ پر رُک سیک کے علاوہ ان تمام کھڑکیوں اور دروازوں کا بوجھ جھک رہا تھا جو میرے دائیں اور بائیں مکانوں میں مجھے دیکھ رہے تھے اور ان چہروں اور دھاتوں کا بوجھ بھی تھا جو ویران سڑک کے وسط میں چلتے ہوئے ایک پیکر کو دیکھ رہے اس کی قومیت اور رنگ کے بارے میں تذبذب میں تھے۔ اس کی حماقت کے بارے میں تذبذب میں نہ تھے...... خوف کا ہاتھ جسم کے اسپنج کو دبا رہا تھا۔ اس میں سے پسینہ پھوٹ رہا تھا...... وہ مجھے دیکھ رہے تھے۔ آنکھیں اور شاید چمکتی نالیوں کے منہ...... میں چل رہا تھا مگر اس میں نیت اور عمل کو دخل نہ تھا۔

بس میرے پاؤں میکانکی سپاہی کی طرح آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔ دھپ، دھپ، دائیں اور بائیں دوسری اور تیسری منزل پر کھڑکیاں تھیں۔ ان کے پیچھے پردے تھے۔ پردوں کے درمیان میں خلا کی ایک لکیر تھی۔ اس کے پیچھے کچھ ہو سکتا تھا...... دستک ہو رہی تھی۔ دل کے دھڑکنے کی دستک جیسے ہاون دستہ مونجھ کوٹ رہا ہو۔ دھم۔ دھم۔ دھم ایک سٹیریو ڈیک میرے اندر پوری والیوم پر کھلا تھا شریانیں اس کی دھمک سے لرز رہی تھیں۔ دھم، دھم، دھم۔ اور باہر کھڑکیوں اور دروازوں میں سے اترتی دہشت سے حاملہ خاموشی.... جس گولی کو تمہارے لیے آنا ہے وہ اپنا تعارف کروا کے تمہارے بدن میں داخل نہیں ہوگی...... لیکن کونسی کھڑکی میں سے کس دروازے کی اوٹ میں سے..... جب گلے کا گھنگھرو بجنے لگے تو احساس ہوتا ہے، کہ انسان نے ابھی زندگی کا ایک لمحہ بھی نہیں گذارا اور ختم...... دنیا کی وحشی خوبصورتی کے نئے رنگ دماغ میں نیون سائنوں کی طرح بھڑکتے ہیں...... میں کیسے ان سے جدا ہوں گا۔ ..... دھم، دھم، دھم...... کل آسمان پر ایک پرندہ ٹھہرے گا اور میرے پاس اسے دیکھنے کے لیے آنکھیں نہ ہوں گی....

پولیس افسر نے اجازت نامے کی مہر پاسپورٹ پر ثبت کی اور میری طرف دیکھا "کیا بات ہے۔ السیدی تمہارا چہرہ سفید ہو رہا ہے آپ ٹھیک تو ہیں؟"

"ہوں" میں نے پاسپورٹ جیب میں رکھا

اور نزدیکی صوفے پر گر گیا۔

"آپ اس وقت کہاں سے آرہے ہیں؟"

"بندرگاہ سے"

"میں نے باہر ٹیکسی رکنے کی آواز نہیں سُنی"

"میں پیدل آیا ہوں"

جیسے سرپٹ دوڑتا ہوا گھوڑا اپنے آگے کھائی دیکھ کر بدکتا ہے وہ ٹھٹھکا "پیدل؟..... صبح سے تین لاشیں آچکی ہیں...... آپ کو یہ رِسک نہیں لینا چاہیئے تھا.... اب آپ یہاں آرام کیجیے کوئی نہ کوئی مسافر اجازت نامہ حاصل کرنے آئے گا۔ اور ہم آپ کو اس کے ہمراہ بھیج دیں گے......" وہ تیزی سے پچھلے کمرے میں گیا اور ایک خنک مشروب لے آیا۔ مشروب میرے گلے میں اُگی کانٹوں کی فصل کو نرم کرتا بخار زدہ جسم میں پھیلنے لگا۔

ایک ایشین کُتا ایک جرمن سیاح کو کھینچتا دفتر کے اندر آیا۔ سیّاح نے اجازت نامے کے لیے درخواست کی۔ پولیس افسر نے اس کے پاسپورٹ پر فوراً مہر لگادی "اور مسٹر کروگر آپ ہمارے دوست کو اپنی ٹیکسی میں بندرگاہ تک لے جارہے ہیں"

"ضرور" جرمن نے سر ہلایا۔

ٹیکسی بندرگاہ میں رُکی۔ میں نے اجازت نامے پر پولیس افسر سے مہر لگوائی اور..... اکاڈینز کی سفید سیڑھی پر تھکے قدموں سے چڑھنے لگا۔ رُک سیک کا بوجھ ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔ آخری سیڑھی پر لیکی امریکی کھڑا تھا ڈھیلے بازوؤں اور ٹانگوں والا...... اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر میرا روک سیک اچک لیا" ویلکم ابورڈ" عرشے پر قدم رکھتے ہی اس نے پرانے دوستوں کی طرح گرمجوشی سے میرا استقبال کیا" میں تمام کارروائی یہاں سے دیکھ رہا تھا...... بوائے جب تم بندرگاہ کے پھاٹک سے باہر نکلے ہو تو میں اپنی زندگی کی شرط لگانے کو تیار تھا کہ تم واپس نہیں آؤ گے...... ویلکم ابورڈ اکاڈینز"

جہاز کے ترک عملے نے میرا ٹکٹ اور پاسپورٹ جمع کر کے رسید لکھ دی۔ ڈیک کلاس اپنے نام کے مطابق عرشے پر نہ تھی بلکہ جہاز کے پیٹ میں تھی۔ انجن رُوم سے ملحقہ ایک ہال نما کمرہ جس میں یوتھ ہوسٹلوں کی طرز پر دو منزلہ بستروں کی قطاریں تھیں۔ میں نے ایک بالائی بستر پر سامان رکھا اور سیلون میں آگیا۔ جہاں گرتھ میرا انتظار کر رہا تھا۔

"کچھ پیو گے؟"

"میرا خیال ہے مجھے اعتراض نہ ہوگا"

سب سے پہلے تم مجھے اپنی زندگی کی کہانی سناؤ۔ پھر میں سناؤں گا"

میں نے مختصراً اپنی زندگی کی کہانی بیان کردی۔

گرتھ دمشق کے امریکی سکول میں ٹیچر تھا۔ اور آج صبح امریکہ جانے والی پرواز کے لیے ایئر لائن کی بس میں بیروت سے ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہوا تھا۔ ایئرپورٹ سے چند میل اِدھر شاہراہ پر فلانجی دہشت پسندوں نے بیریکیڈ کھڑا کر رکھا تھا۔ بس پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی اور ڈرائیور نے پھرتی سے بس کو شہر کی جانب موڑ لیا۔ شہر کے قریب پہنچے تو انہیں ایک اور بیریکیڈ کا سامنا کرنا پڑا جو فلسطینیوں کا تھا۔ یہ بیریکیڈ پہلے موجود نہیں تھا بلکہ اس وقفے کے دوران کھڑا کیا گیا جب وہ اس مقام سے گذر کر ایئرپورٹ کی طرف جاچکے تھے۔ یہاں بھی مشین گنوں نے انہیں پیچھے مڑنے پر مجبور کردیا۔ اب وہ کہیں بھی نہیں جاسکتے تھے ایک جانب فلانجی ایئرپورٹ کا راستہ روکے ہوئے تھے اور دوسری طرف فلسطینی شہر میں داخل نہیں ہونے دیتے تھے۔ بس میں سوار تین امریکی نوجوانوں نے فیصلہ کیا کہ سڑک چھوڑ کر یہاں سے سمندر تک پیدل جایا جائے اور وہاں سے کسی طور سے شہر پہنچا جائے۔ باقی مسافر تو کسی غیبی امداد کے انتظار میں بس میں دبکے رہے اور گرتھ اور دو امریکی چھپتے چھپاتے سمندر کی طرف چل دیئے۔ ساحل پر پہنچ کر انہوں نے ایک مچھیرے سے اس کی کشتی کا سودا طے کیا اور اسے گھسیٹتے ہوئے بندرگاہ میں آگئے اور پھر یہاں پر بقول گرتھ "بوائے اوہ بوائے ہم کیا دیکھتے ہیں کہ بندرگاہ میں ایک جہاز اور یورپ جارہا ہے اور آج ہی جارہا ہے۔ چنانچہ ہم نے ماضی کی تمام محبوباؤں کو یاد کیا، ان کے ہونٹ چومے اور جہاز میں داخل ہوگئے۔ خوش قسمتی تم ایک کُتیا ہو اور ہم تم سے محبت کرتے ہیں۔"

"مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے جہاز حرکت کر رہا ہے"

وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پھر منہ کھول کر ہنسنے لگا۔ جہاز حرکت نہیں کر رہا میں شائد تھوڑا سا نشے میں ہوں کیونکہ ابھی صرف پانچ بجے ہیں اور وقت روانگی دس بجے رات دیا گیا ہے"

"اگرچہ میں بالکل نشے میں نہیں ہوں مگر مجھے بھی کچھ دیر سے محسوس ہو رہا ہے جیسے جہاز چل رہا ہے...... مگر یہ ہو نہیں سکتا"

ہم دونوں اٹھ کر باہر عرشے پر آگئے.... ہم بندرگاہ سے تقریباً دو کلومیٹر باہر آچکے تھے..... گرتھ ہر ایک سے پوچھتا پھرتا تھا کہ کیا اس وقت دس بجے ہیں اور اگر صرف پانچ بجے ہیں تو جہاز کیوں چل رہا ہے۔ بالآخر عملے کے ایک رکن نے بتایا کہ بیروت کے حکّام نے جہاز کو وارننگ دی تھی کہ وہ تاریکی ہونے کے بعد مسافروں اور عملے کی سلامتی کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ اس لیے فی الفور بندرگاہ خالی کردیا جائے۔

"اور ان مسافروں کا کیا ہوگا۔ جو پروگرام کے مطابق رات نو بجے کے قریب جہاز پر سوار ہونے کے لیے آئیں گے؟"

"شام کے بعد بندرگاہ تک آنے کے لیے تو ہیلی کاپٹر درکار ہوں گے۔ جتنے مسافر آنے تھے آچکے"

عرشے پر صرف چند مسافر تھے۔ جو ڈری ڈری آنکھوں سے بیروت کی پیچھے ہٹتی عمارتوں کو دیکھ رہے تھے۔ بندرگاہ کا ویران علاقہ فٹ بال کے خالی میدان کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے پیچھے عمارتیں خاموش تھیں۔ ان عمارتوں میں لوگ انتظار کر رہے تھے۔ کس کے ہاتھ میں غلام ہے۔ اور کس کے ہاتھ میں بادشاہ کوئی نہیں جانتا...... بندرگاہ سے دور ہو کر ہم ساحل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ہجن راکس نظر آنے لگیں اور ان کے پیچھے روشے کی ویران سڑک..... اکلوتی کار کا ایک نقطہ سڑک پر رینگ رہا تھا۔ شہر کا آسمانی منظر خوف سے عبارت تھا کسی گھنی آبادی میں سے دھوئیں کا ایک ڈولتا مینار آسمان کو اٹھتا ہوا بکھر رہا تھا۔ یہاں سے بیروت مجھے بہت اکیلا دکھائی دیا۔ ساحل پر بیٹھا ہوا ایک دیوزاد گم شدہ بچہ جو آنے والے کل کی دہشت سے سہما ہوا تھا۔ لیکن میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ میرے ہاتھ میں نہ بادشاہ تھا اور نہ غلام۔ میں صرف ایک

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

نزار قبانی (لبنان)

محبت اور پٹرولیم

ترجمہ: منو بھائی

کب سمجھو گے؟
کب سمجھو گے؟
کہ میں تمہاری دوسری آشناؤں جیسی نہیں
ہوں
مالِ غنیمت بھی نہیں ہوں
اور نہ ہی کوئی ایسا عدد ہوں
جو تم اپنے ریکارڈ میں درج کر سکو

کب سمجھو گے؟
کب سمجھو گے؟
اے چیچک زدہ چہرے اور ٹانگوں والے
بے مہار صحرائی اونٹ
کب سمجھو گے؟

اور ان کاروں کے ذریعے
جو تم اپنی شہزادیوں کے قدموں میں
ان گنت تعداد میں پھینکتے رہتے ہو
کہاں چھوڑ آئے ہو
اپنے اونٹوں کی کوہانیں؟
کہاں چھوڑ آئے ہو۔
اپنے بازوؤں کے نقش و نگار؟
کہاں چھوڑ آئے ہو
اپنے خیموں کے سوراخ

بات کرتے ہوئے ندامت محسوس کرتے ہیں
کب سمجھو گے؟
غلاظتوں کے کیڑے اے تیل کے شہزادے
تم تلذذ کے جھاڑو کی طرح
گندگی میں لتھڑے ہوئے ہو
پٹرولیم تمہارا ہے
اسے اپنی داشتاؤں کے قدموں میں نچوڑ دو
پیرس کے نائٹ کلبوں
نے تمہارے ظرف کو ہلاک کر دیا
اور تم نے یروشلم کو بیچ دیا
اپنے بزرگوں کی ہڈیاں فروخت کر دیں
جیسے کہ اسرائیل کے بھالوں نے
تمہاری بہنوں کے حمل نہیں گرائے
اور تمہارے گھر تباہ نہیں کئے
اور تمہارے قرآن نہیں جلائے

کہ میں تمہارے سگرٹوں کی راکھ نہیں بن سکتی
تمہارے سرہانوں کی زینت بننے والے
ہزاروں سروں میں سے کوئی سر بھی نہیں ہوں
اور نہ ہی کوئی بت ہوں
جو کسی بڑے نیلام میں رکھا جا سکے
میں وہ چھاتی بھی نہیں ہوں
جس کے گداز مرمر پر
تم اپنی بدنما انگلیوں کے نشان چھوڑ جاؤ
کب سمجھو گے؟
کہ تم مجھے اپنی دولت اور شہزادگی سے
حیران نہیں کر سکتے
اور یہ کہ تم کبھی دنیا پر قبضہ نہیں کر سکتے
اپنے تیل کے ذریعے
اپنی مراعات کے ذریعے
اور اس پٹرولیم کے ذریعے
جو تمہارے لہراتے ہوئے چغوں سے خارج
ہو رہا ہے

اے پھٹے ہوئے ٹیڑھے پیروں والے
خواہشوں کے غلام
تمہاری بیویاں
محض تمہارے مشاغل کا سامان ہیں
خیموں میں تمہاری ہوس کے بستروں پر ڈھیر ہیں
تمہارے ایوانوں کی دیواروں پر کیڑوں کی
صورت
حنوط شدہ ہیں
کب سمجھو گے؟
کب؟
اے بسیار خور ندیدے!
کب سمجھو گے؟
کہ میں ان میں سے نہیں ہوں
جو تمہاری دوزخ سے خوف زدہ ہوں
یا تمہاری جنت میں دلچسپی رکھتی ہوں
کہ میرا وقار تمہارے سونے کے ڈھیروں سے
زیادہ قیمتی ہے

جیسے کہ اس نے اپنے جھنڈے
تمہارے جھنڈوں کی دھجیوں پر نہیں
لہرائے
جیسے کہ وہ تمام لوگ جو جافا میں
حیفہ میں
اور بیر شیبا میں درختوں پر لٹکائے گئے
تمہارے کچھ نہیں لگتے تھے۔
یروشلم اپنے لہو میں ڈوب رہا ہے
جب کہ تم اپنی خواہشات کے شکار
آسودگی کے مریض
عیاشی کے اسیر
یوں سو رہے ہو
جیسے کہ یہ المیہ
تمہارے المیے کا حصہ نہیں ہے۔
کب سمجھو گے؟
تمہاری روح میں انسانیت کب
جاگے گی؟

غزلیں

مہکے چمن نہ آئی صبا میرے سامنے
اب کیا بھرم گلوں کا رہا میرے سامنے
تو اور میرے حال کی تجھ کو خبر نہ ہو
اے دردِ ہجر آنکھ اٹھا میرے سامنے
بیتی ہوئی بہار پہ گریاں ہوا جو میں
اک پھول کھلکھلا کے ہنسا میرے سامنے
رویا نہ حال زار پہ جس کے کبھی کوئی
برسے گی اب وہ کھل کے گھٹا میرے سامنے
دل کو جلا کے میں ابھی بیٹھا تھا مطمئن
یہ کیا دھواں سا اٹھنے لگا میرے سامنے
اٹھتی ہے اب نہ گرد نہ ریگ رواں کا زرد
خالی پڑا ہے دشت وفا میرے سامنے
جعفر جو بھر رہے ہیں میری دوستی کا دم
ان دوستوں کو لاؤ ذرا میرے سامنے

جعفر شیرازی

جب تک گردیں ذرے ہیں آوارہ ہیں آوارہ ہوں
جب تک دشت میں رستے ہیں آوارہ ہیں آوارہ ہوں
کیسے اپنے دل میں ان کا درد بسا کر بیٹھ رہوں
جب تک سوکھے پتے ہیں آوارہ، ہیں آوارہ ہوں
اشک بہاتا پھرونگا ان کے پیچھے پیچھے، کہاں کہاں
جب تک ابر کے ٹکڑے ہیں آوارہ، ہیں آوارہ ہوں
کوئی بھی پابند نہیں کر سکتا پھول کی خوشبو کو
جب تک جب تک جھونکے ہیں آوارہ ہیں آوارہ ہوں
مجھ کو چین نہیں آسکتا مجھ کو چین کہاں جب تک
بال اس کی زلفوں کے ہیں آوارہ، ہیں آوارہ ہوں
نِکل نکل کر یہاں سے رستے اس کے گھر کو جاتے ہیں
جب تک گلیاں کوچے ہیں آوارہ، ہیں آوارہ ہوں
ان کی روٹ ہیں ہو کر میں بھی کبھی تو اس کو دیکھونگا
جب تک چاند، ستارے ہیں آوارہ ہیں آوارہ ہوں
جعفر میں نے ابتک بات نہیں مانی تھی دنیا کی
اب تو وہ بھی کہتے ہیں آوارہ، ہیں آوارہ ہوں

کیا میرا افسانہ ہے کیا میری کہانی ہے
ایک آگ کا دریا ہے بہتا ہوا پانی ہے
کیا کھیل دکھایا ہے رنگوں کا بھنور نے
کہ ایک کہانی ہے پت جھڑ کی زبانی ہے
اے دوست ہٹا دیں یہ دیوار جو حائل ہے
میں ہوں کہ جواں ہوں اور تیری بھی جوانی ہے
کاغذ کا بنا کر گل اس نے یہ کہا مجھ سے
اس سالگرہ پر اک چھوٹی سی نشانی ہے
پھر آج وہی لڑکی چوراہے پہ ٹکرائی
کل جس کو کہا تھا کہ فیشن کی دیوانی ہے
اے شمس غزل اپنی جلدی سے سنا ڈالو
گھر چل کے ابھی تم کو روٹی بھی پکانی ہے

شمس تبریز

پوچھئے مت مجھ سے میں نے کیا کیا
پیار سے دشمن کو بھی اپنا کیا
یادِ ماضی جب کبھی آئی مجھے
دیر تک میں آئینہ دیکھا کیا
زندگی سے دور میں ہوتا گیا
زندگی کا میں نے جب پیچھا کیا
آج مجھ سے وہ ملینگے شام کو
یوں تو سورج روز ہی ڈوبا کیا
کیا کروں احساس کی شدت کو میں
مثلِ شیشہ روز ہی ٹوٹا کیا
کون ہوں میں دوسرا بتلائے کیا
خود سے میں اپنا پتا پوچھا کیا
لیجئے میں بھی سڑک پر آ گیا
لوگ کہتے ہیں کہ یہ اچھا کیا
کر دیا میرے مقابل آئینہ
شکریہ یہ آپ نے اچھا کیا

عشرت صدیقی

فیض احمد فیضؔ سے مُلاقات

شفیع عقیل

اسی ہفتے پاکستان کے عالمی شہرت یافتہ شاعر، ادیب اور دانشور جناب فیض احمد فیض طویل عرصہ کے بعد وطن واپس آئے تو ان سے ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات ۲۷ نومبر کو صبح کو کراچی میں محترمہ بیگم مجیدہ ملک کے گھر پر ہوئی۔ تقریباً دو گھنٹے تک فیض صاحب سے ادب کے حوالے سے باتیں ہوئیں اور اس طرح انہوں نے اپنی گفتگو میں ادب کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا۔ جہاں تک اردو ادب کے موجودہ معیار اور رفتار کا تعلق ہے اس سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ "ابھی تو ہم آئے ہیں ——— ابھی کیا کہا جا سکتا ہے۔ اب دیکھیں گے، پڑھیں گے تو پھر کچھ پتہ چلے گا۔" اس کے باوجود میں نے انہیں کہا کہ "آپ کو کچھ کتابیں رسالے تو پہنچتے رہے ہوں گے اس لئے کچھ اندازہ ہو گا؟" اس پر فیض احمد فیض صاحب نے کہا۔ "ادبی فضا میں ایک تبدیلی ضرور ہوئی ہے کہ اب ادیب اور شاعر پاکستان کی علاقائی زبانوں میں بھی لکھ رہے ہیں اور تخلیقات پیش کر رہے ہیں۔ لکھتے تو وہ پہلے بھی تھے لیکن اب یہ رجحان زیادہ نظر آتا ہے۔ اس سے اردو زبان کو بھی فائدہ پہنچ رہا ہے۔" میرے اس سوال پر کہ "کیا اردو ادب کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ادب کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے؟" فیض نے جواب دیا۔ "اگرچہ اردو زبان کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں اس کی عمر کم ہے مگر غالبؔ اور اقبالؔ کو پیشِ نظر رکھیں تو اردو ادب کو ان زبانوں کے ادب کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔" بہرصورت ذیل میں جناب فیض احمد فیض کا انٹرویو، سوالات اور جوابات کی صورت میں پیش ہے۔ یہاں یہ بات ضرور ذہن میں رہے کہ انٹرویو کے وقت سوالات کی ترتیب اور تھی لیکن تحریر کرتے وقت میں نے ان کی ترتیب قدرے بدل دی ہے تاہم سوالات کے جوابات فیض احمد فیض صاحب ہی کی زبان اور الفاظ میں ہیں۔

سوال:۔ فیض صاحب، ایک بات پوچھوں، بڑی رسمی سی بات ہے کہ آپ نے ابتداء میں جب شاعری کی طرف رجوع کیا تو کیا اس کی کوئی خاص وجہ تھی۔ یا صرف شوق تھا یا کوئی ماحول کا اثر تھا۔؟

فیض:۔ شاعری کی طرف رجوع کرنا، اول تو پہلے یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے دماغ میں یا آدمی کے ذہن میں شاعری کا کوئی کیڑا موجود ہے یا نہیں ہے؟۔ پہلی شرط تو وہ ہوتی ہے۔ دوسری شرط یہ ہوتی ہے کہ کوئی جذباتی تجربہ اس قسم کا ہو جس کو شعر میں منتقل کرنے کی انگیخت ہو۔ تیسرے یہ ہے کہ آس پاس کے سماجی اور معاشرتی اور سیاسی حالات اس قسم کے ہوں کہ ان کا دماغ یا ذہن پر اتنا بوجھ پڑے کہ آدمی ان کے اظہار کی کوشش کرے۔ تو یہ سبھی چیزیں ایک جگہ تھیں۔ ایک تو جیسے میں نے عرض کیا کہ جب ہم نے لکھنا شروع کیا تو وہ اقتصادی بحران کا زمانہ تھا۔ اس اقتصادی بحران میں بے روزگاری، غربت، اور افلاس اور سارے معاشرے میں ایک کرب و اضطراب کی کیفیت تھی۔ اور پھر اپنے ذاتی تجربات بھی ہوتے ہیں، وہ بھی تھا۔ تیسرے یہ کہ ہمیں حسنِ اتفاق سے اساتذہ ایسے مل گئے جو لاہور شہر میں جمع تھے۔ اول تو ہمارے سیالکوٹ شہر میں بھی شاعروں کا کافی چرچا تھا۔ علامہ اقبال کی وجہ سے، اور کچھ شاعروں کی وجہ سے، ہمیشہ سے تعلیمی اعتبار سے اور ثقافتی اعتبار سے ترقی یافتہ شہر تھا۔ پھر جب ہم لاہور گورنمنٹ کالج آئے تو یہاں پر جمگھٹ تھا ستاروں کا۔ خوش قسمتی سے طالب علمی ہی کے زمانے میں ہمیں ان کی محفل میں داخلے کا شرف حاصل ہو گیا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مرکزی نکتہ جو تھا وہ صوفی تبسم کا ہاتھ تھا اور ان کی بیٹھک تھی۔ شام کو وہاں سب جمع ہوتے تھے۔ سالک صاحب اور حسرت صاحب مہری چند اختر اور ڈاکٹر تاثیر۔ ان کی صحبت حاصل ہوئی اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کی صف میں شامل ہو گئے۔ یہ سب باتیں تھیں، اس وجہ سے شاعری شروع کی۔

سوال:۔ اسی سلسلے میں اگر میں آپ سے یہ پوچھوں کہ اچھی شاعری کے لئے کن چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ یہ چیزوں کا لفظ میں نے غلط استعمال کیا ہے میری مراد یہ ہے کہ اس میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔؟

فیض:۔ خوبیاں تو خیر۔ وہ لمبا مضمون ہے۔

سوال:۔ پھر بھی اختصار سے کچھ کہیں۔؟

فیض:۔ سب سے پہلے تو بڑھئی کا کام آنا چاہیئے۔ وہ آتا ہے کہ نہیں آتا ہے۔ وہ تو خدا کی دین ہے۔ وہ تو آدمی خود پیدا نہیں کر سکتا۔ ہے تو ہے، نہیں ہے تو نہیں ہے۔ پہلی شرط تو وہی ہے کہ ذہن میں وہ جوہر موجود ہے یا نہیں ہے۔ اس کے بعد پھر یہ ہے کہ آدمی کی نظر کتنی وسیع ہے اور آپ کے دل میں جگہ کتنی ہے۔ اگر آپ صرف اپنی ذات تک، اپنی نظر محدود رکھیں تو اس میں بھی اچھی شاعری پیدا ہو سکتی ہے لیکن محدود قسم کی شاعری ہو گی۔ لیکن اگر آپ یہ تین دائرے جو ہیں۔ ایک تو اپنی ذات کا دائرہ ہے۔ ایک جو اپنی قوم ہے یا معاشرہ ہے، ایک اس کا دائرہ ہے۔ تیسرے جو ساری دنیا ہے۔ بمعنی انسانی برادری ہے، تیسرا اس کا دائرہ ہے۔ اس میں آدمی نے جو کچھ بھی لکھنے کی کوشش کی ہے اس کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔؟ یہ تو ہی ایک بات اور دوسری بات وقت کے اعتبار سے ہے یعنی تین دائرے تو جگہ کے لیجئے یہ ہیں، دوسرے تین دائرے وقت کے ہیں۔ ایک تو ماضی ہے۔ اس کی روایت کے بارے میں آپ کی آگاہی کتنی ہے؟ اور اس سے آپ کا ربط کتنا ہے۔؟ وہ بھی لازم ہے۔ دوسرے یہ ہے کہ ہم عصر وقت کے جو تقاضے ہیں اور جن حالات میں آپ زندگی بسر کر رہے ہیں، اس میں لوگوں پہ کیا گذر رہی ہے۔؟

تین مکانی دائرے ہیں اور تین زمانی دائرے

جسقدر وسعتِ نظر اور دقتِ نظر ہوگی اسی کے مطابق تخلیقات کا معیار ہوگا

اس پر آپ کی نظر کتنی ہے۔؟ یہ دوسرا دائرہ ہے یعنی آپ کے ہم عصر وقت کے حقائق جو ہیں ان کا دائرہ۔ اور تیسرے یہ کہ اگلا، جو آنے والا زمانہ ہے اس کے بارے میں آپ کے ذہن میں کوئی کسی قسم کا ہیولہ ہے یا نہیں ہے؟ یا آپ کو ماضی اور حال کو سامنے رکھتے ہوئے مستقبل کے بارے میں کوئی خواب دکھائی دیتا ہے کہ نہیں دیتا۔؟ تو یہ تینوں چیزیں ایک طرف تو یہ تینوں مکانی دائرے ہیں اور ایک طرف تینوں زمانی دائرے ہیں۔ ان میں جس قدر وسعتِ نظر ہوگی کسی کی، اور جس قدر دقتِ نظر ہوگی، جتنی بھی کسی کی استعداد ہے، جتنی کسی کی پہنچ ہے، اسی کے مطابق اس کی تحریروں کا اور اس کی تخلیقات کا معیار ہوگا، اور وہی اس کا مقام ہوگا۔

سوال :۔ فیض صاحب اس ضمن میں کچھ فنی تقاضے بھی ہیں؟

فیض :۔ وہ تو ہیں ہی۔ یعنی وہ تو پہلی شرط ہے نا اگر آپ کو بڑھئی کا کام ہی نہیں آتا تو کیا ہوگا۔ تو پھر فن کا معاملہ ہے۔ ایک طرف فن اور دوسری طرف موضوع، دونوں ملا کے، اس کو دونوں پر قدرت حاصل ہو تو پھر ہی بڑی شاعری پیدا ہوتی ہے۔

نظم۔ یا۔ غزل

سوال :۔ آپ کے بارے میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کی غزل کی شاعری نمایاں ہے اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ نظم کے شاعر ہیں۔ آپ نے بھی کبھی اس سلسلے میں سوچا۔؟

فیض :۔ نہیں، سوچنے کا تو سوال نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کوئی مضمون آتا ہی غزل کی صورت میں ہے یعنی غزل کا مسئلہ یہ ہے کہ کسی استاد کا مصرعہ ذہن میں آ گیا۔ غزل میں سہولت تو یہ ہے کہ آپ کو کوئی نیا نقشہ نہیں بنانا پڑتا۔ نقشہ پہلے سے موجود ہے۔ اگر زمین آپ کے ذہن میں آ گئی، بحر ایک ذہن میں آ گئی۔ اور معلوم ہوا کہ جو کچھ کہنا ہے وہ اسی صورت میں بہتر طریقے پر ادا ہو سکتا ہے۔ اس میں ایک آسانی یہ رہتی ہے کہ نقشہ موجود ہے۔ نظم کا تو یہ ہے کہ اس میں آپ کو خود بنانا پڑتا ہے کہ اس کا پیٹرن کیا ہے؟ اس کا نقشہ کیا بنانا ہے۔؟ تو بعض موضوعات ایسے ہوتے ہیں، ان میں پھیلاؤ اتنا ہوتا ہے کہ ان کو غزل میں سمیٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یا وہ آتا ہی اسی صورت میں ہے کہ نظم کی صورت ہی میں ادا ہو سکتا ہے۔ تو ہم نے کبھی شعوری طور پر یہ اختیار نہیں کیا کہ آج غزل اور آج نظم لکھیں۔ وہ خود ہی آتا ہے۔ شعر جو ہے وہ اپنے پاؤں ساتھ ہی لیکر آتا ہے۔

ہمارا موجودہ ادب

سوال :۔ فیض صاحب آپ کا کیا خیال ہے، ہمارے ہاں جو ادب پیدا ہو رہا ہے اس میں نثری ادب کا پلہ بھاری ہے یا نظم کا۔ نظم سے میری مراد منظومات ہے۔؟

فیض :۔ بھئی اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ فیصلہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ویسے اگر ہم قدیم ادب کا جائزہ لیں تو نظم زیادہ لکھی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعر کو جو سہولتیں حاصل ہیں وہ نثر لکھنے والوں کو نہیں۔ شعر آسانی سے دوسرے تک پہنچ جاتا ہے۔ شاعر کی بات پہنچ جاتی ہے۔ اس کے لئے کئی ذرائع موجود ہیں۔ پھر ہمارے یہاں مشاعرے کا ادارہ موجود ہے۔ اس کی وجہ سے شاعر کو آسانی سے سننے والے اور پڑھنے والے مل جاتے ہیں۔

سوال :۔ کیا اس میں آواز کو بھی کچھ دخل ہے؟

فیض :۔ ہاں اس کا بھی دخل ہے کہ شعر کو آپ نغمہ بنا سکتے ہیں۔ پھر آپ موسیقی میں ڈھال سکتے ہیں۔ پھر یہ کہ ایک ذریعہ فلم ہاتھ آ گیا، فلم کے ذریعے سے بھی شعر لوگوں تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے پاس تشہیر کے ذرائع نثر کی نسبت زیادہ ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جس میں تھوڑا بہت جوہر ہے وہ سب سے پہلے اس طرف توجہ دیتا ہے۔ نثر میں تھوڑی بہت مزدوری کرنی پڑتی ہے۔ اس کے لئے ناشر درکار ہوتا ہے۔ شاعر کو تو ناشر کوئی نہ بھی ملے تو مشاعرہ تو موجود ہے نا۔ اس لئے اس کو بڑا فائدہ ہے۔

سوال :۔ منظومات کی بات ہو رہی ہے تو ذرا تخصیص کر لیں اور یہ بتائیے کہ ہمارے ادب میں نظم جاندار معلوم ہوتی ہے یا غزل۔؟

فیض :۔ بھئی یہ کوئی تخصیص نہیں کی جا سکتی۔ اس وجہ سے اچھی غزل جو ہے، میں سمجھتا ہوں وہ لکھنا زیادہ مشکل ہے ایک اچھی نظم لکھنے سے کیونکہ غزل میں اساتذہ اتنا کچھ کہہ گئے ہیں کہ اس میں کوئی نیا راستہ پیدا کرنا، یا کوئی نیا مضمون نیا موضوع اور اس کے لئے نئی طرز ادا اور نئے الفاظ اور نئے استعارے، اس میں نئے تلازمے پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے۔ اس لئے نظم تو نسبتاً زیادہ آسان ہے کیونکہ اس کے لئے آپ اپنا نمونہ خود پیدا کرتے ہیں۔ مختلف ادوار میں کبھی نظم کا رواج زیادہ ہوتا ہے اور کبھی کم۔ پھر ایسے ہی جیسے ۱۹۳۰-۳۵ء میں مثلاً نظم کہتے تھے، یہ غزل تو بہت پرانے زمانے کی ہے۔ اس کی وجہ سے غزل پیچھے رہ گئی۔ لیکن اس کے بعد غزل میں ایک نیا رنگ پیدا ہوا اور غزل کا پھر سے عروج ہو گیا۔ تو یہ نہیں کہا جا سکتا کسی طرح بھی کہ غزل کو برتری حاصل ہے یا نظم کو برتری حاصل ہے۔ یہ تو انحصار اس پر ہے کہ اچھی غزل کسی نے کہی یا کسی نے اچھی نظم کہی۔

نثری نظم

سوال :۔ فیض صاحب! آج کل جو نثری نظم لکھی جا رہی ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔؟ یعنی آپ کو پسند ہے یا ناپسند۔؟ اس کے بارے میں کچھ کہیں۔؟

فیض :۔ اس میں بھی یہ ہے کہ لکھنے کی کوئی بات ہو کوئی جذبہ ہو، اور وہ جو کچھ بھی آپ نے لکھا ہے وہ ٹھیک طریقے سے ادا ہو جائے تو وہ تو نظر آ جاتا ہے۔ لیکن یہ نثری نظم کو ہم سمجھتے ہیں کہ یا نظم ہوتی ہے یا نثر ہوتی ہے، نثری نظم کوئی نہیں ہوتی۔ یا تو شاعرانہ نثر ہوتی ہے یا وہ نظم ہوتی ہے۔ نظم میں جو ایک تلازمہ اس کا ہے کہ اس میں کوئی آہنگ اس میں کوئی لحن، کوئی لے ہونی چاہیے۔ کوئی ضروری نہیں کہ وہ عروض ہو۔ یہ ضروری نہیں جو ہمارے بندھے ہوئے سانچے ہیں وہی ہوں۔ اس میں ایجادات بھی ہو سکتی ہیں، اختراعات ہو سکتی ہیں۔ لیکن نالہ کو پابند نے کرنا ضروری ہے۔ حیات کی کوئی لے بھی ہو۔ لے کوئی بھی ہو لیکن وہ لے اس میں ہونی چاہیے تاکہ نظر آئے کہ وہ نظم ہے نثر نہیں ہے۔ کیونکہ نثر بکھیرنے کو کہتے ہیں اور نظم یکجا کرنے کو کہتے ہیں۔ تو نظم کے تو نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس کا کوئی قاعدہ قانون ہے۔ وہ قاعدہ آپ اپنا لیجئے، استادوں کو نہ مانیئے لیکن قاعدہ تو ہونا ہی چاہیئے۔

مرسلہ ملا

سوال :۔ فیض صاحب، آپ علامہ اقبال سے بھی ملے ہیں، اس کے بارے میں کچھ بتایئے۔؟

فیض :۔ اقبال تو ایک طریقے سے ہمارے چچا تھے کیونکہ ہمارے ابا کی ان سے دوستی تھی۔ ہمارے ابا اور وہ ساتھ ہی رہے اور ساتھ ہی انہوں نے بیرسٹری کی اور ساتھ ہی آئے تھے۔ اگرچہ وہ ہمارے سامنے سیالکوٹ میں کبھی رہے نہیں۔ جب ہم نے ہوش سنبھالا تو وہ لاہور جا چکے تھے لیکن جب ہم نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا تو ہمارے ابا ہمیں انہی کے پاس لے گئے تھے سفارشی خط کے لئے۔ قاضی فضل حق ہوا کرتے تھے فارسی کے پروفیسر۔ ان کے نام علامہ سے خط لیا تھا اور ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ قاضی فضل حق نے خط لے لیا۔ ہم نے کہا جی خط پڑھ کر واپس کر دیجئے۔ ہمارا خیال تھا کہ خط اپنے پاس رکھ لیں گے لیکن قاضی فضل حق نے خط ہمارے حوالے نہیں کیا، اپنے پاس رکھ لیا۔ اس کے بعد

احمد سوز

(۱)

ہاتھ میں عصا لے کر ہم انا کا چلتے ہیں
ہم سے پہلے تاریکی ہو، تو کیا سجھائی دے
اس کی توتلی باتیں سن کے رو پڑا ہوں میں
مجھ کو اس کا مستقبل اپنا سا دکھائی دے
شہر میں اجالوں کے لوگ سایہ سایہ ہیں
کوئی میرے ہاتھوں میں لمحہ بھر خدائی دے

(۲)

راستے لیس ہیں بندوقوں سے
شہر جنگل کے برابر دیکھوں
لوگ، دیوار، درخت سب ہیں سماں
پہلا پتھر میں اکٹھا کر دیکھوں
جسم سج دھج کے تو رہتے ہیں، مگر
تلملاتی ہوئی روحوں کو سراسر دیکھوں

(۳)

کچھ سنگ بار قہقہے ہیں میری پشت پر
اے وحشت جدال مجھے ظرف ناب دے
اس شہر خفتگاں میں لگاتے رہو صدا
ممکن ہے کوئی جاگ پڑے اور جواب دے
وہ اپنی بوڑھی غزلیں سنانے لگے گا سوز
تو اس سے مل نہ ذہن کو مرے عذاب دے

(۲)

بہت غم زدہ ہوں رُلا کے نہ جا تو
مجھے آنسوؤں میں سجا کے نہ جا تو
مری وسعتوں میں کمی آ نہ جائے
سمندر کو دریا بنا کے نہ جا تو
مسلسل نوازش، عنایت، توجہ
محبت یوں مجھ سے چھپا کے نہ جا تو
خموشی کے ہونٹوں پہ رکھ دے صدائیں
عقیدت کی خوشبو چرا کے نہ جا تو
ٹھہرنا مسافر کی قسمت نہیں ہے
کوئی قید مجھ پہ لگا کے نہ جا تو

جاوید

(۱)

پھول خوشبو، دعا ہوئے یارب
وہ بھلے لوگ کیا ہوئے یارب
جھوٹ، مکر و فریب دنیا میں
دھوپ کا سلسلہ ہوئے یارب
دھول آنکھوں میں جھونک دیتے ہیں
راستے خوش ادا ہوئے یارب
ہر طرف ایک ہو کا عالم ہے
واقعے واہمہ ہوئے یارب
یاد ایسے میں آ گئے ہوتے
خواب گھر کا پتہ ہوئے یارب

(۲)

یہ عارضہ تجھے لاحق ہوا مگر کب سے
سنائی دیتی ہے سرگوشی ہوا کب سے
بس ایک لفظ کی مہلت ملی ہے دنیا میں
بھٹک رہا ہوں میں اطراف مدعا کب سے
گناہ سب کے کہاں تک عزیز ہیں تجھ کو
عذاب ہم پہ مسلط ہے اے خدا کب سے
اتر رہے ہیں کئی قہر آسمانوں سے
کسی خیال میں گم ہے مری دعا کب سے
دلوں کا ترب حفاظت پہ ہو گیا مامور
غبار بن کے چمکتا ہے فاصلہ کب سے

افتخار امام صدیقی

(۱)

بکھرے تمام شہر پناہوں کے ساتھ ہیں ! آباد جن سے تھی کبھی یادوں کی انجمنیں
جتنے بھی ڈاکہ زن ہیں سپاہوں کے ساتھ ہیں وہ سلسلے تو اب بھی نگاہوں کے ساتھ ہیں
منزل کی دھوپ بن کے سمٹنے لگے ہو تم ! واقف ہیں اپنے قتل کے ہر فیصلے سے ہم
ہم گرد راہ ہو کے بھی راہوں کے ساتھ ہیں قاتل ہمارے خود بھی گواہوں کے ساتھ ہیں
نیکی ہمیں قبول مگر بھولتی نہیں —
وہ لذتیں جو اپنے گناہوں کے ساتھ ہیں

دو۲ آوازیں

ڈاکٹر محمد یعقوب عامر

پہلی آواز

تمہاری زندگی کا شیرازہ تو بکھر چکا ہے۔ اب وہ کہاں ہے۔ جس کے لئے ایک نئی دنیا بسانے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ تم تنہا ہو بالکل تنہا۔ ذرا حقیقت پر غور کرو۔ تمہاری ہستی ایک وہم بن کر رہ گئی ہے۔ اب کس سہارے پر زندہ رہو گے۔ تم بے سہارا ہو اور بالکل بے مصرف۔ ذرا نظر اٹھا کر دیکھو اس پار وہ کون ہے؟ دیکھو۔ وہ تمہیں پکار رہا ہے۔ اس کی مدد کرو۔ یہ شام و سحر کا سلسلہ بہت بڑا جال ہے۔ کہیں اس میں پھنس کر نہ رہ جانا۔ خدارا سنبھل جاؤ۔ توڑ دو۔ ان بندھنوں کو۔ جلدی کرو بہت جلدی۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ تمہاری نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ کیا تم دیکھ رہے ہو اسے۔ ہاں ہاں۔ یہ وہی چہرہ۔ جو تمہارے لیے مسکرا تا رہا ہے۔ جو تمہاری راہوں کو منوّر کرتا رہا ہے۔ کیا تمہیں اس سے عقیدت ہے۔ واقعی عقیدت ہے۔ تو جاؤ۔ دیکھو۔ شاید اسے تمہارا انتظار ہے۔ دیکھا تم نے کیا سوچ رہے ہو۔ بڑھو اس طرف۔ خدارا جلدی قدم اٹھاؤ۔ ابھی وقت ہے۔ پھر تم اسے نہ پا سکو گے۔ کیا پیچھے ہٹ گئے۔ کیا رکھا ہے۔ یہاں۔ دیکھتے نہیں۔ ہر طرف اندھیرا ہے۔ تاریکی۔ تنہائی۔ سناٹا۔ بے چارگی اگر تم اس وقت ٹھٹھک گئے تو پھر بھٹکتے ہی رہو گے۔ کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھاؤ گے بے وجہ کی ٹھوکریں۔ کون ساتھ دے گا تمہارا۔ کون ہے یہاں۔ دیکھو۔ اس طرف دیکھو وہ مسکرا رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ تم بے وفا کہلائے جاؤ۔ محبت پر حرف آئے گا۔ تمہاری محبت پر پھر کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہو گے۔ ابھی وقت ہے جلدی کرو۔ خدارا بہت جلدی۔

دوسری آواز

کب تک دھوکا دیتے رہو گے۔ اپنے آپ کو دیکھو ہلاکت کے راستے پر تم جاؤ۔ یہ جرم ہے۔ بہت بڑا جرم۔ سوسائٹی۔ ہاں یہی سوسائٹی۔ جس نے تمہیں جنم دیا ہے۔ تم سے کچھ چاہتی ہے اس کا حق ہے تم پر۔ تمہاری زندگی پر، تمہارے جذبات پر۔ تمہارے دل پر۔ اس کا حق نہ سارو۔ یاد کرو۔ اپنے فرض کو۔ اپنی ذمہ داریوں کو۔ فرض نبھاؤ۔ فرار حاصل نہ کرو اور اس فرار سے بھی کیا حاصل۔ یہ مت بھولو کہ تمہاری گرفت نہ ہوگی۔ نہ سماج تمہیں معاف کرے گا نہ قدرت۔ تمہاری نجات۔ تمہاری عاقبت تمہارے دوست۔ عزیز۔ احباب اقربا۔ سوچو ایک بات سوچو۔ زندگی بہت بڑی نعمت ہے۔ قدر کرو۔ اس کی غنیمت جانو۔ ان لمحات کو۔ اس کے آگے کیا ہے کچھ نہیں۔ ابھی وقت ہے۔ یہ وقت ضائع نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں پچھتانا پڑے۔ پھر یہ وقت ہاتھ نہ آئے گا۔

پہلی آواز

تم خو غرض ہو۔ ذلیل مطلب پرست یہ سب تاویلات ہیں۔ تمہیں دنیا چاہیے۔ سب بہانے ہیں یہ۔ مایا موہ۔ اُف اتنا بڑا فریب۔ محبت۔ وفا۔ جان بازی۔ یہ سب الفاظ ہیں۔ مٹا دو ان الفاظ کو۔ جاؤ عیش کرو۔ وہ چہرہ ——— شرم کرو۔ تم اس کے قابل نہیں ہو۔

دوسری آواز

ہوش میں آؤ۔ تم وقت سے پہلے کچھ نہیں کر سکتے۔ نہ یہ وفا ہے اور نہ جانبازی یہ خودکشی ہے۔ ایک ذلیل جرم۔ بزدلی۔ حرام

پہلی آواز

تم زندہ مر چکے ہو۔ کاش تم شہید ہو سکتے۔

دوسری آواز

تم زندہ ہو۔ تم زندہ ہو۔

پہلی آواز

یہ غلط ہے۔ میرا کہا مانو۔

دوسری آواز

یہ سراسر غلط ہے۔ میرا کہنا مانو۔

ہندوستان کے چوٹی کے فن کاروں کے ذریعہ ترقی پسند شاعر کیفی اعظمی کے فکر و فن، شاعرانہ عظمت اور ادبی مقام و مرتبے کا تعین ——— کیفی اعظمی کی نمائندہ نظموں اور غزلوں کا انتخاب اعلیٰ اور نفیس کتابت و طباعت کے ساتھ فروری ۸۳ء میں منظرِ عام پر آ رہا ہے۔

قیمت صرف ۵ روپے

نوٹ: سالانہ خریداروں کو یہ نمبر صرف دو روپے میں دیا جائے گا۔ آج ہی مبلغ ۲۰ روپے ارسال کر کے کیفی اعظمی نمبر رعایتی قیمت پر حاصل کریں اور ایک سال تک سہیل کا مطالعہ بھی کریں۔

پتہ: ماہنامہ سہیل ریور سائڈ روڈ گیا۔ ۸۲۳۰۰۱

اسرائیل نے بیروت میں فلسطینیوں کا وحشیانہ قتل شروع کروا دیا ہے — خبر

کوئی اور خدمت میرے آقا!

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

امریکی صدر ریگن نے لبنان کے واقعات پر دکھ اور افسوس کا اظہار کیا ہے —— خبر

میری شاعری کی عورت

پروین شاکر

پروین شاکر جو کچھ منہ در آتا ہے لکھ دیتی ہے۔ فہمیدہ ریاض نے کراچی سے عورت کی بغاوت اور شاعری کا جو فیشن نکالا تھا اس نے پروین کی بہت مدد کی۔ بغیر کسی جدو جہد کے اسے وہ تمام اعزازات مل گئے جو فہمیدہ نے کانٹوں بھرے راستوں پر چل کر حاصل کئے تھے "صد برگ" اس کا ناکام تجربہ ثابت ہوئی ہے سلیم احمد اور ضیاء جالندھری دونوں کو گلہ ہے کہ شاعری اور ڈائری میں کچھ تو فرق ہونا چاہیئے جبکہ پروین نے اپنی زندگی کی پوری ڈائری کو بھی شاعری بنا دیا ہے۔ یہ وہی ڈائری ہے جس میں گھر کا حساب کتاب اور کپڑوں کی فہرست بھی لکھی ہوتی ہے۔ اس طرح "خوشبو" سے "صد برگ" تک وہ گھر میں چھپی بیٹھی وہ لڑکی ہے جو محفوظ چار دیواری کی محفوظ ہاتھوں اور محفوظ معاشرے کی متمنی نظر آتی ہے کبھی اپنے کو قرۃ العین حیدر سمجھنے لگتی ہے اور کبھی میرا بائی..... حالانکہ دونوں نے محفوظ چار دیواری کے تصور کو اٹھا کر معاشرے کے منہ پر مار دیا تھا جبکہ پروین نے ..... لیکن چھوڑیئے خود اس سے سنتے ہیں کہ وہ کیا کہتی ہے۔

میری شاعری کی عورت بہت زیادہ خوبصورت ہے اور میرے پڑھنے والوں کی ایک بڑی تعداد دراصل اسی عورت کے عشق میں گرفتار ہے۔ "خوشبو" پڑھتے ہوئے جو تصویر ذہن میں بنتی ہے، وہ ایک گڑیا سی، پیاری سی لڑکی ہے جس کی سوچیں بھی اسی کی طرح دلآویز ہیں

اس احساس کے محسوس ہونے میں عمر اور رتبے کی کوئی قید نہیں۔ نہایت عابد وزاہد قسم کے نقاد ہوں یا کوئی بیورو کریٹس، بیحد محتاط قسم کے فل کرنلز ہوں یا کھلنڈرے کیڈٹس۔ مسئلہ سب کا ایک ہی ہے۔ اور اس موقعہ پر میری ایک تازہ نظم پڑھتے چلیئے! "کتوں کا سپاسنامہ"۔

گو بڑے نہیں سے، باچھوں سے گرتی ہوئی رال سے شروع ہوتی ہے، جیسے کہیں خاموشی، کہیں تحمل، کہیں جھڑکی اور کہیں مذاق میں بات ٹالی جاتی ہے۔ اور آپ جانیں کہ MALE DOMINENT سوسائٹی میں مرد کی اگیو کو ہرٹ کرنا کتنا خطرناک کام ہے! اور یہ کام اس پروین شاکر کو کرنے پڑتے ہیں جسے اس دنیا میں رہنا ہے، جسے اپنا رزق بھی کمانا ہے اور گھر بھی سلامت رکھنا ہے۔!

سو میں ایک بہت اچھی بیٹی، ایک بڑی تابعدار بیوی اور بہت قربانیاں دینے والی ماں ہوں۔ ایک نارمل

زندگی گزارنے کے لیے عورت کو ایسا بننا پڑتا ہی ہے کیونکہ وہ عورت ہے سو وہ عمر بھر اس ڈرا ئیک کی خاطر دوسرے درجے کی شہری بن کر رہنے پر مجبور ہے۔

دوسرے درجے کی ایک شہری میں بھی ہوں، مگر گھر اور شہر دونوں اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں۔ اس طرح کہ مجھے بات بدلنے کی اجازت بھی نہیں، کیونکہ اچھی لڑکیاں حکم عدولی نہیں کرتیں لیکن میری شاعری کی عورت سراپا انکار ہے۔ اس نے جب تک اپنے جذبے کی قدر دیکھی۔ مجسم سپردگی رہی لیکن جونہی زندگی کا رویہ تبدیل ہوا۔ یہ عورت بپھر گئی۔

اب کیا ہے جو تیرے پاس آؤں
کس مان پہ تجھ کو آزماؤں

بات اپنے جانے کی تھی تو اس کا لہجہ یہ تھا مگر کوئی آپ چل کے آجائے تو پھر؟ آپ نے "کن رس" پڑھی ہے

یہ جھکی جھکی آنکھیں
یہ رُکا رُکا لہجہ
لب پہ بار بار آ کے
ٹوٹتا ہوا فقرہ
گرد میں اٹی پلکیں
سر جھکائے آیا ہے
ایک عمر کا بھولا
دل ہزار کہتا ہے
ہاتھ تھام لوں اس کا
چوم لوں یہ پیشانی
لوٹنے نہ دوں تنہا
کوئی دل سے کہتا ہے
سارے حروف جھوٹے ہیں
اعتبار مت کرنا
اعتبار مت کرنا

اعتبار کرنا نہ کرنا ثانوی چیز ہے لیکن کشور ناہید میری جان، دیکھ اس وقت صرف ہیں اور تم موجود ہیں ذرا میرے سر پہ اپنا ہاتھ رکھنا۔ ہاں اب بتاؤ۔ ایسے لمحے میں تم اسے دھتکار سکتی ہو" "خوشبو" کی متذبذب لڑکی "صد برگ" تک پہنچتے پہنچتے تھوڑی سی فیصلہ کن سوچ کی مالک ہو جاتی ہے۔ آنکھوں میں جب خوابوں کا موتیا اتر آئے تو احساس دھندلا جاتا ہے مگر جب یہی جالے کٹ جائیں تو چہرے اور ارادے شفاف ہو کر سامنے آجاتے ہیں اور یوں لہجے کی قطعیت یا بالفظ دیگر کہے کی سختی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ پر یہ کیسی IRONY ہے کہ شاعری میں جوں جوں میرا لہجہ تلخ ہوتا جا رہا ہے زندگی میں میں اتنی ہی سافٹ ہوتی جا رہی ہوں۔ ایک طرف "لیڈی آف دی ہاؤس" جیسی نظمیں ہیں جنہیں پڑھ کر ایک دوست نے کہا تھا کہ یوں لگتا ہے جیسے نیم کا رس رگوں میں بھرنے لگا ہے۔ دوسری جانب کیپٹن نصیر کے جوتے پالش کرتے ہوئے ایک لمحے کو بھی مجھے اپنی یہ نظم یاد نہیں آتی۔

سو ایک چھت کا بوجھ مجھ پر بھی ہے اور یہ بڑا مقدس بوجھ ہے کہ اس نے مجھے دھوپ سے اور تاریکی سے اور سردی سے بچا رکھا ہے مگر اس کی قیمت میں نے روشنی اور رہائش کی شکل میں ادا کی ہے۔

صد برگ میں جس عورت سے آپکی ملاقات ہوگی اس کے ہاتھوں کو غور سے دیکھئے گا۔ MOTHER CARE کی FIRST THING IN THE MORNING کے باوجود آپ کو اس کے ناخن ٹوٹے پھوٹے نظر آئیں گے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ناخن دیواروں کو چھیلتے چھیلتے گھس گئے ہیں۔

اس کی مٹھی میں بہت روز رہا میرا وجود
میرے ساحر سے کہو اب مجھے آزاد کرے

لیکن پروین شاکر کی یہ خواہش، پروین نصیر افورڈ نہیں کر سکتی کہ یہاں مجھے ایک ایسے ہاتھ نے بھی تھاما ہوا ہے جس کی گرفت میری روح پر ہے، یعنی میرا بیٹا مراد۔

مجھے آج بھی وہ لمحہ یاد ہے۔ میں نے نیم بے ہوشی کے عالم میں سنا تھا،

"ITS IS A BOY"

اور مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت میرے چہرے پر کیا کیفیت تھی۔ ایک عجیب سکون کہ نرس کی حیران کن آواز آئی،

"SHE IS SMILING"

میں اس وقت بھی مسکرا رہی ہوں۔ میرے بیٹے کا چہرہ میرے سامنے ہے۔ یہ نہ ہو تو زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں کہ ؎

اس کے ہی بازوؤں میں اور اسکو ہی سوچتے رہے
جسم کی خواہشوں پہ تھے، روح کے اور جال بھی

روح کے یہ اور جال کیا ہیں۔ "صد برگ" کو پڑھتے ہوئے ایک دوست نقاد نے کہا،

"یار! تلخی بہت ہے۔ "پر" وصال، سپردگی" اور "ہنی مون" جیسی بے حد نرم و شیریں نظمیں لکھنے کے بعد تم نے "بارگزیدہ" "اونٹ" کا حافظہ رکھنے والی معقول نظمیں کیوں لکھ دیں۔ بے چارے قاری کو عجیب سا ذہنی دھچکا لگتا ہے۔" میں ذاتی طور پر ذہنوں کو جگانے کے لئے اس طرح کے دھچکوں پر یقین نہیں رکھتی مگر جب دکھ آپ کی ہڈیوں میں اترنے لگے تو کراہنے کی اجازت تو ہونی چاہیئے نا۔ علیحدہ سوچنے والی لڑکیوں کے لئے دنیا جہنم کا درجہ رکھتی ہے اور اس کے کچھ شعلے آپ تک بھی پہنچ جائیں تو کیا حرج ہے۔

کوئی آپ کے دامن پر چراغ رکھ دے تو آپ شاید مروت کر جائیں مگر آپ کی ماں کے سر سے دوپٹہ اتار لے تو آپ کا فوری ردِ عمل کیا ہوگا۔ ایسے موقع پر برتی جانے والی مروت بزدلی ہے اور خدا کا شکر ہے کہ میں بزدل نہیں۔ "صد برگ" کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جنہیں لکھ کر مجھے فرض کی ادائیگی کا سا سکون ملا ہے۔ اپنی زمین سے محبت مجھ پر اسوقت کھلی جب میں نے اسے دکھ میں دیکھا، سو وہ نظمیں بھی جو بظاہر تلخ ہیں ان کی بنیاد محبت ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ خدا مجھے اتنی جرأت اور دے کہ اپنے ہنر کو اپنی شناخت بنا کر زندہ رہ سکوں۔ لیکن جس ملک میں کھیلوں کا شمار سپیریئر آرٹس میں ہوتا ہو وہاں شاعری کا سکوپ کیا ہوگا۔ قلم پر زندہ رہنے والے ادیب بخوبی جانتے ہیں اس لئے میں نے قلم سے رزق کمانے کا کبھی نہیں سوچا۔ زندگی میں پہلے ہی صلح ناموں کی کمی نہیں کہ بندہ

یہاں بھی ہاتھ ہٹائے۔ مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے جب میں بڑے شاعروں کو ریڈیو اور ٹی وی پر ضائع ہوتے اور خداوندانِ صوت وصورت کی جوتیاں چاٹتے دیکھتی ہوں۔ غزلوں، نظموں کی حد تک تو غنیمت ہے لیکن جب گیت کے نام پر انتہائی بے تکی اور اخباری ہونے کی حد تک سپاٹ باتوں کو لکھے پاتی ہوں تو مجھے ان اداروں سے وحشت

ہونے لگتی ہے۔ وہ جو بے خبری میں مارے گئے ان کا تو ذکر کیا مگر وہ جو دیدہ و دانستہ تر نوالہ بن رہے ہیں وہ اس قابل ہیں کہ ان کا زندگی میں ہی سوگ منالیا جائے کیسے کیسے طرحدار ادیب اپنے گھر کے چولہے روشن رکھنے کے لیے ریڈیو کا ایندھن بنتے رہے ایک دو نام ہوں تو گنواؤں۔ ٹی وی۔ اس عشوہ طراز کے کاٹے کا تو کوئی علاج نہیں۔ ایسے ایسے گوشہ نشینوں کو اس نے شاعر سے ایکٹر کر دیا ہے جو سٹوڈیو میں مشاعرہ ہو تو غزل بعد میں کہتے ہیں سوٹ پہلے سلواتے ہیں بلکہ اکثر تو غزل کہنے کی زحمت بھی نہیں کرتے، سوٹ سے ہی کام چلا لیتے ہیں۔ میر قبیلے کا ایک استحصال اور بھی ہو رہا ہے جس کے متعلق میری نظم پڑھیئے۔ "پوسٹ ڈنر آئٹم"

لیڈی آف دی ہاؤس

سبز ریشمی پردے
اور زرد غالیچہ
کارنیس کے اوپر
صادقین کی تصویر
مغربی دریچے سے
اک ذرا قریں ہو کر
قیمتی پیانو ہے
پھولدان اس جانب
میری میری جان اس جانب
بچے سو چکے ہیں کیا۔؟
تم بھی تھوڑا دم لے لو
پھر یہ کام کر لینا
خوب یاد آگیا
شام سے ذرا پہلے
کچھ سنگھار کر لینا

میرے نرم دل محبوب!
مری خوشنما آنکھیں
جن کے شبنمی آنسو
تیرے مسکراتے لب
چومتے نہیں تھکتے
کیا اگر تیری ہو گئیں

(تیری ملکیت ہوتیں)
اس قدر حسین لگتیں!
تیرا دل یونہی دکھتا!

مجھ پہ کیا ترس کھانا
میرا کوئی آقا ہو
(نام میں بھلا کیا ہے)
بوجھ مجھ کو ڈھونا ہے
اور عمر بھر میرا
یونہی صرف ہونا ہے

پروین شاکر

افسانہ

وشوامتر

ورِیندر پٹواری

جیپ کے ہارن نے وِشوامتر کو چونکا دیا۔ اسکی گرفت ڈھیلی ہوگئی اور شانتی اسکی چنگل سے آزاد ہوکر فوراً سرسوتی ماں کے سینے سے لپٹ کر زار زار رونے لگی۔

وِشوامتر کی آنکھیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح لال تھیں اس کا چہرہ جو ایک پرسکون جھیل کی طرح خاموش رہتا تھا آج ایک سیلابی دریا کی طرح لمحہ بہ لمحہ کیفیت بدلتا رہتا تھا۔ غصّے سے وہ اپنا دماغی توازن اس حد تک کھو چکا تھا کہ اگر آنند آشرم کے احاطے میں پولیس کی جیپ داخل نہ ہوتی تو شاید اُس نے شانتی کا گلا دبا کر اُسے ختم کر دیا ہوتا۔

کھڑکی سے جھانک کر جب اُس نے جیپ سے اترتی ہوئی ایک عورت کو دیکھا تو اس کا قہر آلودہ غصہ یوُں ٹھنڈا ہو گیا۔ جیسے ایک دہکتی ہوئی لال لال سلاخ کو پانی کے ٹب میں ڈال دیا گیا ہو۔

رُوپ متی۔ روپ متی!! اس کے ہونٹ تھرتھرانے لگے اور خوشی کے آنسو پونچھتے ہوئے وہ یوں دوڑنے لگا گویا ایک ہجوم میں کھوئے ہوئے بچے کو ایک شناسا چہرہ نظر آیا ہو۔

وہ عورت واقعی رُوپا تھی۔

روپا اچانک اپنے بیڈرُوم سے غائب ہوگئی تھی اور وِشومتر رات بھر اپنی روپ متی کو یوں تلاش کرتا رہا جیسے کوئی رِشی منی خدا کو تلاش کر رہا ہو۔

"رُوپ متی تم کہاں ہو!" وہ رات بھر دیوانوں کی طرح چلاتا رہا اور مجنوں کی طرح چلتا رہا۔

روپ متی کہاں ہے؟ کس حال میں ہے۔ زندہ ہے یا مُردہ؟ جانے کتنے ہی ایسے سوالات تھے جو رات بھر اُس کے جذبات کو گھسیٹ گھسیٹ کر جنوں کی طرف لے جا رہے تھے۔ جبھی اُسے چلتے چلتے یوں محسوس ہوتا رہا جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ اور کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا رہا جیسے کوئی اس کے آگے آگے دوڑتا ہوا نکل رہا ہو اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ کبھی آہستہ آہستہ چلتا رہا جیسے دلدل میں پاؤں رکھے ہوئے چل رہا ہو۔ اور کبھی وہ یوں ایک سنسان سڑک پر دوڑتا رہا گویا ایک گھوڑا سوار ابہت ہی تیز رفتار سے اپنے دشمن کا تعاقب کر رہا ہوں۔ مگر کون تھا اس کا دُشمن؟

اگر آج زندگی میں پہلی بار دشمن کا عکس اس کے ذہن میں اُبھر کر اسے اس قدر نہ ڈرا رہا تھا تو وہ پاگلوں جیسی حرکتیں کیوں کر کرتا۔ رُوپا شاید بہت دور نکل گئی تھی۔ یا وہ کہیں آس پاس ابدی نیند سو رہی تھی وہ رات بھر یہی سوچتا رہا۔ جبھی بار بار قدموں کی آہٹ جھاڑیوں کے پیچھے سنائی دینے والی سرگوشیاں یا دور دور سے سنائی دینے والی صدائیں وہ جھوٹی تسلیاں ثابت ہوتی تھیں جو اس کے شکستہ دل کو عارضی طور پر بہلاتے ہوئے اس کی انا کو ٹھیس پہنچا رہی تھیں۔ اور وِشوامتر نے اپنی انا کو اتنی بلندی پر پہنچایا تھا جہاں سے اُسے ساری دنیا ایک فٹ بال نظر آ رہی تھی یعنی ٹھوکریں مار کر وہ دُنیا کا وجود ختم کر سکتا تھا یہ اس کا ارادہ نہ سہی مگر سوچ ضرور تھی۔ لیکن آج کے اس سانحہ نے اس کے وجود کو اس قدر کمزور بنا ڈالا تھا کہ عُمر کی اُونچی اُونچی فصیلیں بھی ان آنسوؤں کو نہیں روک سکتی تھیں جو وہ غمِ فراق میں بہائے جا رہا تھا۔ رواں رواں گویا ایک ٹوٹے باندھ سے اُچھلتا پانی۔

رونے دھونے کو جذبات کی شدت بیان کرنے والا مُفکر آج زندگی میں پہلی بار رو پڑا تھا فقط اس لیے کہ وصل کی شب ایک قصہ فراق بن چکی تھی۔ یہ رات اسکی سہاگ رات تھی۔ اور رُوپا اپنی خواب گاہ سے یوں غائب ہو گئی تھی جیسے آسیب کا وُجود۔

وِشوامتر شہر کا ایک مانا ہوا دانش ور ہی نہیں بلکہ ایک عظیم تخلیق کار بھی ہے ایک نامور سنگتراش۔ جس نے شہر سے دور پہاڑیوں کی گود میں اپنی ایک الگ دنیا بسا رکھی ہے۔ ایک ایسی دنیا جس میں کسی کا دخل نہیں۔

ایک سفید رنگ کا مکان جس کے درو دیوار بھی سفید ہیں۔ پردے بھی سفید ہیں۔ فرنیچر سفید رنگ کا ہے۔ قالین سفید رنگ کے ہیں فرش سفید رنگ کا ہے۔ اور جہاں ہر کمرے میں قدم قدم پر سنگ مرمر کے مجسمے ہیں۔ ہر طرح کے مجسمے جنہیں وشوامتر نے خود تراشا ہے جنہیں وِشوامتر نے خود سنوارا ہے۔ جنہیں وِشوامتر نے نام دیئے ہیں "روپ متی"۔ "پھول متی وغیرہ وغیرہ۔ اور وہ ان مجسموں کے ساتھ رہتا ہے۔ ان کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرتا رہتا ہے۔ ان سے مشورے کرتا رہتا ہے۔ ان کو ہدایتیں دیتا ہے۔ ان کے ساتھ ہاتھ سے ہاتھ ملا کر ناچتا ہے۔ اور یوں وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اوروں کے لئے یہ پاگل پن سہی گھر کے نوکروں کے لیے یہ جادو ٹونا یا روحانی کرشمات سہی مگر یہی وِشوامتر کی دُنیا ہے۔ اُس کی اپنی بنائی ہو دنیا۔ اپنے بسائے ہوئے لوگ۔ کبھی کبھار اپنی سفید رنگ کی کار میں وہ شہر چلا بھی جاتا ہے۔ وہ بھی بقول اس کے وہ اپنے فیملی لوگوں کی تلاش کرنے یعنی پتھر کے ان ٹکڑوں کو جمع کرنے۔ جنہیں وہ تراش کر اور پھر نام دے کر کسی نہ کسی نئی تھیوری یا نئے فلسفے کے ساتھ وابستہ کر کے پریس کانفرسیں دیتا رہتا ہے حالانکہ ان فلسفوں سے دنیا اوب گئی ہے۔ تصورات کی اس مصنوعی دُنیا میں اسے کھینچ کر باہر نکالنے کی کوشش کس نے نہیں کی تھی۔ رشتہ داروں نے دوستوں نے۔ ہم عصروں نے — حسین دوشیزاؤں نے۔ مگر اس نے کسی کو قربت کا شرف تک نہیں بخشا تھا۔ جبھی وہ ایک تماشا بن چکا تھا اور دُنیا تماشائی۔

ایسے ہی وِشوامتر اپنی زندگی کے پچاس سال گذار چکا تھا۔ اور اب اسکے سفید لباس کا ساتھ اسکی سفید لمبی داڑھی اور لمبے لمبے سفید بال بھی دے رہے تھے۔ مگر یہ رشی منیوں کی طرح رہنے والا سنگتراش رُوپا کو دیکھتے ہی یوں بدل گیا تھا جیسے موسم۔

رُوپا کو وِشوامتر نے پہلی بار آنند آشرم کے دروازے پر تب دیکھا تھا۔ جب وہ ساتھ بہتی ہوئی ندی سے ایک بڑا پتھر نکال رہا تھا۔ رُوپا کو دیکھتے ہی اُسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کسی انجانی آرٹ گیلری میں اس نے اپنا ہی تراشا ہوا مجسمہ دیکھ لیا ہو پھر روپا سامنے سے نکل گئی تھی۔ وِشوامتر کو یوں محسوس ہوا تھا۔ جیسے وہ اپنی تخلیق کو انگلی پکڑ کر چلنا پھرنا سکھا رہا ہو۔

سیدھی سادھی سفید رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے اپنے چہرے کے آدھے حصے کو گھونگھٹ سے ڈھانپ کر وہ واقعی چل رہی تھی جیسے ایک سنگ مرمر کا بُت خود بخود چلنے پھرنے لگا ہو۔ پہلی بار جب رُوپا نے معنی خیز نظروں سے ایک اجنبی کو دیکھا تھا۔ تو وہ سہم کر سرسوتی ماں کے کمرے میں چُھپ گئی تھی۔ مگر دوسری ملاقات میں وشوامتر نے جانے کیسے اسے اپنائیت کا احساس دلایا تھا اور وہ تقریباً روز ہی آنند آشرم کے آہنی گیٹ سے جھانک کر وِشوامتر کو یوں دیکھتی رہی جیسے جنت سے آئی ہوئی اپسرا منیکا مہارشی وِشوامتر کی تپسیا بھنگ کرنے کی ترکیب سوچ رہی تھی اور پھر ایک دن وشوامتر نے ندی سے وہ پتھر نہیں نکالا اور وہ رُوپا کو روپ متی کا نام دے اُسے چاہنے لگا۔

اپنی رُوم پارٹنر اور بہت ہی پیاری سہیلی شانتی سے پل بھر بھی الگ نہ رہنے والی رُوپا بھی وِشوامتر کے لیے بے معنی تھے۔ جبھی وہ گفتگو تو کیا اُسے میں دلچسپی لینے لگی، حالانکہ وشوامتر کے اس نرالے انتخاب سے بد دل ہو کر شانتی کئی بار اس کے نزدیک آنے کی کوشش کرتی رہی مگر شانتی کا پسلی چہرہ ناک بدن کو وِشوامتر اپنے قریب بھی نہیں آنے دیتا تھا۔

مگر وشوامتر کے انتخاب نے اوروں کو بھی چونکا دیا تھا۔ پتھر کی طرح بے تاثر چہرہ۔ نیپالوں کی طرح چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور چینو کی طرح ابھرے ہوئے گال۔ موٹے موٹے ہونٹ جو بہت کم ہلتے تھے اور جب ہلتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے پھاٹک کھولی جا رہی ہو۔ ہر سوال کا جواب وہ "ہاں" یا "نہ" میں دیتی تھی۔ اتنا ہی نہیں اس کو پولیس نے سڑکوں پر گئی رات کئی بار بھیک مانگتے ہوئے پکڑا تھا اور اس لیے آنند آشرم میں داخل کروایا گیا تھا۔ جب کہ شانتی ایک دیوداسی لڑکی تھی جسے سرسوتی ماں نے بچپن سے پالا پوسا تھا۔

سرسوتی ماں دل ہی دل میں روپا سے سخت نفرت کرتی تھی۔ جب کہ وہ شانتی سے بہت پیار کرتی تھی۔ گو یہ پودلی ہوئی بچی نہیں بلکہ اس کی بیٹی تھی۔ مگر جب وِشوامتر نے رُوپا کا ہاتھ مانگا تھا تب سرسوتی ماں نے شانتی کا ہاتھ ہی دینا چاہا تھا۔

سرسوتی ماں کی تجویز سُنتے ہی وِشوامتر پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہو گئی تھی جیسے ایک مہارشی شراپ دینے لگا تھا۔

شادی طے ہو گئی تو رُوپا کی نظریں شرم سے جھک گئی تھیں جب کہ شانتی یوں بھڑک اٹھی تھی جیسے بجھتے ہُوئے شعلوں پر پیٹرول کے چھینٹے ڈال دیئے گئے ہوں۔ اس کی آنکھیں شیرنی کی طرح چمک اُٹھی تھیں پھر لب تھرتھرائے تھے۔ اُس نے وِشوامتر کے قریب آ کر کچھ کہہ بھی ڈالا تھا۔ مگر اُس نے تو کیا کسی نے بھی اسکی دھیمی آواز نہیں سنی تھی۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے سسکیوں میں ڈوب گئی تھی۔ دونوں سہیلیوں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تھا۔ تو شانتی اپنے بال نوچتی۔ چیختی چلاتی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ شادی ہوئی۔ مگر شادی کیا تھی۔ بس وشوامتر کی ضد۔ اس نے رُوپا کو کار میں بٹھا دیا اور دونوں اک طرف چل پڑے تھے شانتی کرب و کراہ پر قابو پا کر سفید کار کو تب تک دیکھتی رہی — جب تک کار میں بیٹھے سفید پوش دولہا دلہن نظروں سے اوجھل نہ ہوئے۔

گاؤں میں ہنگامہ برپا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ غالباً یہ پہلا موقع تھا جب لوگوں نے دولہا دلہن کو سفید کپڑوں میں دیکھا تھا۔ انہیں پتھروں سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ جو سمجھ رہے تھے وہ ہنس رہے تھے جو نا سمجھ تھے وہ حیران تھے کہ یہ سب کیا ہے۔ مگر وشوامتر کو دونوں میں کسی کی فکر نہ تھی۔ جب فکر نہیں تو ذِکر کس بات کا۔ شاید یہی سوچ کر وہ اپنے مجسموں سے معمول کی طرح پیار کرتا رہا جب کہ رُوپا لہن خواب گاہ میں گئی رات تک وِشوامتر کا انتظار کرتی رہی۔

آج اس کی سہاگ رات تھی۔ مگر وِشوامتر کے لیے یہ رات مرادوں کی رات تھی۔ آج ایک عاشق اور معشوق کا ملن نہیں تھا۔ ایک تخلیق کار اور اسکی تخلیق کا آمنا سامنا تھا۔ اُس کا تصور پتھر کی دیواروں سے آزاد

ہوکر چلنے پھرنے لگا تھا۔ اور وہ اپنی کامیابی پر اتنا ہی خوش تھا۔ جتنا کروڑوں سال پہلے مہارشی وشوامتر اپنے اردگرد ایک نئی کائنات کو جنم دے کر مسرور تھا۔ مگر ——

اپنی کامیابی کا ڈنکا بجاتے ہوئے جب وشوامتر نے خوابگاہ کا دروازہ کھولا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔

اس کی روپ متی غسل خانے میں بھی نہیں تھی۔

وہ مکان کے کسی کمرے میں بھی نہیں تھی —— وہ احاطہ کے کسی کونے یا گاؤں کے کسی گوشے میں بھی نہیں تھی۔

یقیناً اُسے کوئی اغوا کر کے لے گیا تھا۔ اور ساتھ میں اسکی کار اور تمام پُونجی بھی۔

مکان میں گویا ایک بھیانک زلزلہ آگیا تھا۔ اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے صدائیں دیتا رہا۔

اس کی تپسیا کسی راکھشش نے بھنگ کر دی تھی۔ اور زندگی میں پہلی بار ڈر ایک سوالیہ نشان بن کر اُس کا تعاقب کرنے لگا تھا۔ لیکن پھر بھی اپنی انا کی اونچی اونچی دیواروں کے سہارے چل کر وہ رُوپا کی تلاش میں نکل پڑا۔ اور رات بھر چلتا رہتا تھا۔ غصہ سیمابی کیفیت اختیار کر چکا تھا۔ اور چڑھتا ہوا پارہ بدخیالی کو جنم دے رہا تھا انتقام غصہ کے شعلوں کو ہوائیں دیتا رہا اور جب بھی وہ دشمن کے بارے میں سوچتا تب یا تو شانتی کا چہرہ سامنے آتا یا پھر سرسوتی ماں کا۔ گویا دونوں چہرے بے نقاب ہو چکے تھے اور دونوں کی ڈراونی شکلیں آئینوں سے ملتی جلتی نظر آرہی تھیں۔

اور وہ دونوں کی تلاش میں آنند آشرم پہنچ گیا۔

۔۔۔۔ دونوں کو ایک ہی کمرہ میں دیکھتے ہی وہ ان پریوں ٹوٹ پڑا تھا گویا اس نے ایک اونچی عمارت کے اندر ٹائم بم رکھتے ہوئے دو مجرموں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ سرسوتی ماں کچھ کہتی۔ شانتی کچھ سناتی یا وشوامتر جواب طلب کرتا بارن کی آواز نے سب کو چونکا دیا تھا اور اگر وشوامتر روپا کو دیکھتے ہی احاطے میں نہ چلا گیا ہوتا شاید کچھ بیان کرنے سے پہلے یا کچھ عیاں ہونے سے پہلے ہی سیلابی دریا ان کو اپنے ساتھ بہا کے چل دیا ہوتا۔

"روپ متی"

وشوامتر کو اپنا پیار بھی ملا تھا اور اپنا کھویا ہوا وشواس بھی تخلیق کی قربت اور تخلیق کا اعتماد بھی۔

مگر اچانک زبردست انکشاف ہوا

"وشوامتر صاحب۔ آپ کی روپ متی ایک پیشہ ور مجرم ہے جو ایک خطرناک جرائم پیشہ گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔ کبھی گھریلو نوکرانی۔ کبھی دھوبن کبھی بھنگن کبھی آیا کبھی دائی اور کبھی بھکارن بن کر وہ آس پاس کے شہروں میں کتنے ہی گھر لوٹ چکی ہے۔ آشرم میں پناہ لے کر وہ پچھلے چھ ماہ سے ہماری نظروں سے اوجھل رہنے میں کامیاب تو ہو گئی مگر آج پکڑی گئی وہ بھی شاید اس لئے کہ کار میں تیل نہیں تھا۔ ورنہ۔۔۔۔۔ انسپکٹر شرما نے رُوپا کو نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا نہیں ۔ ایسا فریب ناممکن ہے۔ آپ کی آنکھیں دھوکا کھا گئی ہیں" وشوامتر چلانے لگا۔

"دھوکا تو آپ کھا گئے ہیں۔ رشی مہاراج۔ فقط اس لیے کہ پتھر کے آئینوں میں عکس دیکھنے کے آپ ہی عادی ہو چکے ہیں ہم نہیں۔ اپنے اردگرد خود ہی دُھند پھیلا کر اپنے تصور کے دُھندلے خاکے دیکھ دیکھ کر آپ اصلی چہروں کی پہچان نہیں کر پائے ہیں۔ ٹھنڈے پتھروں کو چھوڑ کر آپ حقیقت کی گرمی اور قدرت کی تپش کو محسوس کرنے کی عادت بھول گئے ہیں آپ ایک مصنوعی دنیا میں رہتے ہیں۔ ایک ایسی دنیا میں جو ریت کے محلوں کی طرح ریزہ ریزہ بکھر کر آپ کی آنکھوں کو اب چبھنے لگی ہے جو موم کے محل کی طرح پگھل کر آپکے ہاتھ پاؤں جلا رہی ہے۔

اس سے پہلے کہ وشوامتر انسپکٹر شرما کی تنقید کو چیلنج کرتا۔ شانتی ایک زخمی بلی کی طرح روپا پر ٹوٹ پڑی۔ اسی کشمکش میں روپا کے سینے کے اُبھار سے نوٹوں کے بنڈل نکلے۔ پکڑ دھکڑ میں اس کا مصنوعی نسوانی وقار بھی دسہرے کے راون کی طرح زمین پر گر گیا اور ایک چھوٹے سے قد کے نیپالی کو دیکھ کر حاضرین سکتے میں آگئے "رُوپا۔ تم" وشوامتر کی آنکھیں باہر آنے لگیں تو شانتی نے چیخ کر کہا۔

رُوپا نہیں۔ روپ سنگھ۔ میرے ہونے والے بچے کا باپ !! مجھ پر ٹھونسا ہوا ایک باپ جسے میں نے چھپانا نہیں چاہا تھا۔ مگر آپ دیکھ نہ سکے۔ آپ تو کیا دُنیا بھی اس فریب کو دیکھ نہ سکی"

یہ کہتے ہی وہ ایک زخمی کبوتر کی طرح زمین پر گرگئی اور سرسوتی ماں اپنے بچے کو کلیجے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دوسروں کو گیان دینے والی خود کیسے انجان رہی۔ وہ یہ سوچتی رہی جبکہ رُوپا دانت پیستا ہُوا گالیاں بکتا ہُوا۔ بیڑی کے لمبے لمبے کش لگاتا ہُوا خود ہی پولیس جیپ میں بیٹھ گیا گویا یہ عارضی جنگ بندی تھی۔ رات کو جب معمول کے مطابق وشوامتر اپنے مکان میں داخل ہوا تو اپنے ہاتھ تراشے ہوئے مجسموں کو دیکھ کر ڈرنے لگا۔

اس نے معمول کی طرح آج بھی باتیں کرنا چاہا مگر ہر قدم پر اُسے یوں محسوس ہُوا۔ جیسے وہ اپنے ہی بنائے ہوئے جال میں پھنس گیا ہو۔ قہقہوں کی فاتحانہ آواز کی بجائے اُسے ہر طرف سے خوف کی آوازیں سنائی تو وہ اپنے آپ سے گھبرانے لگا غالباً ویسے ہی جیسے زہر بموں کے خالق اپنی تخلیق دیکھ کر کبھی کبھار محسوس کرتے ہونگے۔

اچانک اُس نے شیشہ اٹھایا اور رات بھر اپنے تراشے ہوئے تمام مجسمے توڑتا رہا۔

سحر ہونے سے پہلے ہی وہ اپنی بنائی ہوئی دُ مسمار کر چکا تھا صبح ہوتے ہی اُسے جس شدت سے

۔۔۔۔ تنہائی کا احساس ہونے لگا تو زندگی میں پہ یوں محسوس ہُوا جیسے وہ ایک گہری نیند سے بیدار ہو گیا ہو۔ اور تصور کے دُھندلے دُھندلے خاکو کی بجائے اُسے اپنے رشتہ دار دوست اور پڑوسی یاد آئے اور پھر اچانک شانتی یاد آئی۔ غالباً اس لئے کہ اُسے بدلے ہوئے حالات میں شانتی ہی کی ضرورت تھی۔

الفاظ کا سفر

ظہیر غازی پوری کی جدید غزلوں اور نظموں کا مجموعہ صفحات ۱۶۰۔ ڈیما سائیز ——
قیمت ۱۰/۰ روپئے

آشوب نوا

ظہیر غازی پوری کی تازہ ترین غزلیات کا مجموعہ صفحات ۱۴۴۔ ڈیمائی سائیز ——
قیمت ۱۲/۰ روپئے

عصری آگہی پبلیکیشنز۔ رام نگر
شاہدرہ۔ دہلی ۳۲

دھواں اور بو

شفیقہ فرحت

بہت وزنی۔ بھاری۔ گہرا۔ گاڑھا سناٹا
یہاں سے وہاں تک۔
اور وہاں سے وہاں تک
اور وہاں تک
اور وہاں تک
سب کو دبوچے بیٹھا تھا۔
تھکا تھکا تھا ہانپتا ہوا۔
کوئی آواز نہیں۔ کوئی حرکت نہیں۔
نہ اللہ اکبر کے نعرے۔ نہ ہر ہر مہادیو
اور جے بجرنگ بلی کے۔
نہ گولیوں کی سنسناہٹ۔ نہ بم کے
دھماکے۔ نہ تلواروں کی جھنکاریں۔
نہ کوئی آہ — نہ کوئی کراہ — نہ سسکیاں
نہ آنسو
نہ بھاگتے ہوئے پیروں کی دھپ دھپ
نہ گرتے ہوئے جسموں کی دھمک
نہ شعلوں کی لپک
نہ مکانوں اور دوکانوں کے جل جل
کے گرنے کے دھڑاکے
نہ برتنوں کے لڑھکنے کے فلک شگاف
ٹھناکے۔
کچھ نہیں — کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں
آوازوں کے ابلتے کھولتے سمندر
سوکھ گئے
بس آسمانوں تک پھیلتی ہوئی دھویں
کی آڑی ترچھی لکیریں تھیں —
اور جلنے کی کڑوی کسیلی بو۔
دھوئیں، کا رنگ بدلا۔
کالا چتکبرا
مٹیالہ
سفید
مگر یہ جاتا کیوں نہیں۔
کیا یہ ہمارے سروں پر ہمیشہ اسی
طرح سوار رہیگا
اور اپنی پھٹی۔ بوسیدہ۔ سوراخوں
بھری چادر تانے ہر دم ہر لمحہ ہمارے
ساتھ ساتھ چلتا رہیگا۔؟
یہ جلی ہوئی بدذائقہ بو مٹتی کیوں نہیں
کیا یہ ہماری ناک کے نتھنوں کا

ہماری زبان کی نوک کا۔ ہمارے دماغ
کے خلیہ کا حصّہ بن چکی ہے۔؟
دروازہ مضبوطی سے بند تھا اور
دونوں کھڑکیاں بھی
مگر کڑوی کسیلی بو تھی کہ گھسی چلی
آرہی تھی۔
اس نے ناک کس کے بند کرلی اور
سانس لینے کے لئے منہ کھول دیا تو ایسا
لگا۔ جیسے بو حلق میں پہلے سے زیادہ تیز
رفتار سے گھس رہی ہے اور وہیں جمتی جارہی
ہے۔ ٹھوس ہوتی جارہی ہے۔
سخت مٹی کی طرح
سمنٹ کی طرح
فولاد کی طرح
اس کا دم گھٹنے لگا۔ اب اس نے
منہ کو سختی سے بند کیا اور ناک کے پھڑپھڑاتے
ہوئے نتھنوں سے گہرے گہرے لمبے لمبے سانس
لئے۔ پھر بو کا چکر کا لگا۔ اور وہ تیر کھائے
کوّے کی طرح تڑپ کے دھم سے ٹوٹی
کھڑی چارپائی پر گر پڑا
چارپائی چرچرائی
اس کے اپنے اندر کا بچا کھچا ثابت
حصّہ بھی ٹوٹنے لگا۔
اس نے میل بھرے کالے کھردرے
ہاتھ سے بے خواب آنکھیں ڈھانک لیں
مگر دوسرے ہی پل وحشت زدہ ہو کر کھول
لیں
آنکھیں بند کرتے ہی یہ محسوس ہوا
جیسے بند دروازے اور کھڑکیوں کی باریک
جھریوں سے دھواں موج در موج اندر

گھسا چلا آرہا ہے۔
اور وہ دھوئیں کے اس بھنور میں پھنستا جا رہا ہے
چکر پہ چکر کھا رہا ہے۔
اور ڈوب رہا ہے
ڈوب رہا ہے
اسے خود پتہ نہیں وہ کتنے دن سے نہیں سویا۔ جب پتھرائی آنکھوں کو جاگتے جاگتے صدیاں گذر جاتیں تو لاشعور کا کوئی گوشہ ایک آدھ جھپکی لے لیتا۔ اور اس جھپکی میں دھوئیں کا بہاؤ اور تیز ہو جاتا
اور پھیلتے پھیلتے اس کمرے کو گیس چیمبر بنا دیتا
اور پھیلتا۔ تو سارے گھر میں بھر جاتا
اور پھیلتا۔ تو شہر کے ایک ایک گلی کوچے ایک ایک موڑ میں گھس جاتا۔
اور تب۔ کہیں بھی دھوئیں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔
ہر چہرہ مٹ جاتا۔ ہر نقش معدوم ہو جاتا۔
اور پھر کچھ بھی نہ بچتا
اور گھٹی گھٹی بے آواز چیخ کے ساتھ اس کی آنکھ کھل جاتی۔
کیا کرے۔ کہاں جاتے۔
کیسے اس دھوئیں کو بھگائے۔
کیسے اس بو کو مٹائے
کیسے —؟
کب —؟
کب —؟
پتہ نہیں آج کیا تاریخ ہے۔ کون سا دن ہے۔
جانے کتنے جگ بیت گئے
وقت کے پاؤں تو وہیں گڑے کے گڑے ہیں جہاں دھواں اٹھا تھا۔
جہاں کڑوی کسیلی بو پھیلی تھی۔
کوئی آگے بڑھ کے اپنا ہاتھ اس سوراخ پہ کیوں نہیں رکھ دیتا جہاں سے یہ دھواں ابل رہا ہے۔ کسی مہیب کارخانے کی چمنی کی طرح مگر کس کے پاس ہے ایسی ہتھیلی۔
یہ دھواں تو اس ہتھیلی کو بھی اپنے اندر چھپا لے گا
مگر آج ہے کونسی تاریخ۔ ؟
اسے تو کچھ بھی نہیں معلوم۔ اس کے لئے وقت آگے بڑھ ہی کہاں رہا ہے۔
اور اس جیسے بہت سوں کے لئے بھی۔
بلکہ یہ تو پیچھے جا رہا ہے
بہت پیچھے
بہت پیچھے
کہیں یہ اندھا وقت الٹے پاؤں پیچھے بھاگتے بھاگتے کسی اندھیرے غار میں نہ گر جائے
اور پھر وہیں پڑا رہے
صدیوں تک
صدیوں تک
صدیوں تک

•••

ایک تاریخ ساز دستاویز

کالم نگار نمبر

مرتب: فکر تونسوی

معاونین: بشیر احمد ۔ انیس احمد خاں

• ابتدا سے آج تک کے اردو کالم نگاروں کی

تخلیقات کا انتخاب

ان کی تصاویر، کارٹون اور سوانح تین سو سے زیادہ صفحات کی کتابت ہو چکی ہے۔

پتہ: چنگاری ۱۴۱۰/۳ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲

٭ قصہ تین شاعروں کا جو بنگلور کے مشاعرہ میں کلام سنا کر آئے ہیں۔

٭ ________ سلمٰی صدیقی بنام صہبا لکھنوی۔

٭ ________ اکیڈمی آف لیٹرز کے لئے لمحۂ فکریہ!

جب سے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان آمد و رفت کی سہولتوں میں اضافہ ہوا ہے، دونوں ملکوں کے ادیب بکثرت ادھر سے اُدھر جانے اور اُدھر سے ادھر آنے لگے ہیں یہ ادیب اپنے ملک میں جیسے بھی ہوں، دوسرے ملک میں جاکر خاصی اہمیت حاصل کر لیتے ہیں۔ یہاں آنے والوں کے بارے میں تو ہم کچھ نہیں کہیں گے لیکن وہاں جانے والوں کے متعلق اتنا ضرور عرض کریں گے کہ ان میں سے بعض کا نام پہلی بار آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سے سننے میں آیا۔ مثلاً پچھلے مہینے آل انڈیا ریڈیو کے ادبی پروگرام میں بتایا گیا کہ پاکستان کے ایک "مشہور" شاعر کے مجموعۂ کلام کی تقریبِ اجراء دہلی کی غالب اکیڈمی میں ہوئی۔ ہم نے ذہن پر بہت زور دیا لیکن اس نام کا کوئی "مشہور" شاعر ہمیں یاد نہ آیا۔ بہت سے دوستوں سے بھی پوچھا لیکن کسی نے اقرار نہ کیا کہ اس نے "شاعرِ مشہور" کا نام سنا ہے۔ اس سے اندازہ کریجئے کہ پاکستان میں کیسے کیسے مشہور شاعر موجود ہیں۔ جن کا نام تک کسی نے نہیں سنا۔ ایسے شاعروں کو پاکستان واپس آکر اپنی کتاب کی، بجائے خود اپنی تقریبِ اجراء منعقد کرنی چاہیئے تاکہ ان کی شہرت ہندوستان تک محدود نہ رہے۔ ہندوستان جاکر شہرت حاصل کرنے والے شاعروں کے بارے میں ہمارے کرم فرما جناب لاغر مرادآبادی نے ایک شعر بھی کہا ہے۔ شعر تو ہمیں یاد نہیں رہا، اس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ گوہر جب تک دریا کی تہہ میں رہتا ہے، اس پر کسی کی نظر نہیں جاتی، لیکن دریا سے باہر نکلنے کے بعد ہی لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنی قیمتی چیز ہے۔

دونوں ملکوں کے اخباروں میں بھی مہمان ادیبوں کے بارے میں بہت کچھ چھپتا رہتا ہے۔ تین ہفتے ہوئے "جسارت" کے ادبی صفحے پر ہندوستانی روزنامہ "بنگلور" کا اداریہ نقل کیا گیا تھا جو بعض پاکستانی شاعروں کے بارے میں تھا۔ اس اداریہ کو پڑھ کر پاکستان کے ادبی حلقوں میں خاصا شدید ردِعمل ہوا اور یہ کہا گیا...... جو کچھ کہا گیا۔ وہ تو ہم بعد میں بتائیں گے پہلے اس اداریے کا ایک اقتباس پڑھ لیجیے۔ (اگر آپ اسے پہلے پڑھ چکے ہیں تو قندِ مکرر سمجھئے، اگر پہلی مرتبہ پڑھیں تو دل کو مضبوط کرنے والی کوئی دوا کھا لیجئے۔

"۴ دسمبر کی رات کو بزمِ زندہ دلانِ کرناٹک بنگلور کے زیرِ اہتمام لال باغ میں جو ہند و پاک مشاعرہ ہوا، وہ نہ تاریخی تھا نہ شاندار، البتہ یادگار ضرور تھا کہ اتنا ناکام اتنا بے جان، اتنا ٹھنڈا اور مردہ مشاعرہ ہم نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا..... پاکستان کے صرف تین شعراء تھے۔ ایک رئیس امروہوی، ایک اختر فیروز، تیسرے بزم انصاری، رئیس صاحب کے بارے میں سنتے آئے تھے کہ وہ بڑے بلند پایہ شاعر ہیں۔ مگر ہمارے لئے تو وہ نام بڑے اور درشن چھوٹے والا مقولہ ثابت ہوئے۔ اختر فیروز نامی ایک اور پاکستانی کے متعلق بتایا گیا کہ وہ کسی رائٹرز گلڈ کے سیکریٹری ہیں۔ ہوں گے، مگر شاعر بالکل نہیں ہیں کیونکہ جو کلام انہوں نے سنایا۔ وہ بے وزن، بے معنی، بے ربط رہا چنانچہ ایک ہی غزل سن کر عوام پر ایسا سکتہ طاری ہوا کہ پورے مشاعرے پر قبرستان کی سی خاموشی چھا گئی۔

یہی خاموشی ان کے کلام سے بیزاری کا اعلان تھا۔

..... اگر پاکستان کے شاعر ایسے ہی ہیں تو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ یا تو انھیں دور سے ہی سلام کر دیا جائے یا ایسے شاعروں کو بلایا جائے جو اچھا، تازہ اور بامقصد کلام سنائیں اور حقیقی معنوں میں شاعر ہوں، جن کے منہ میں دانت ہوں اور جن کا تلفظ بھی اچھا ہو اور آدابِ مجلس کا خیال رکھتے ہوں اور رئیس امروہوی اور اختر فیروز کی طرح سارا وقت لیٹے پڑے نہ رہتے ہوں کہنے والے کہتے تھے کہ دونوں نے مفت کا مال بہت کھا لیا ہے، اس لئے بیٹھنا دشوار ہو گیا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ پاکستان کے شعراء مجالس میں اتنی غیر مہذب اور ناشائستہ حرکت بھی کرتے ہیں اور پاکستان کا نام خراب کرتے ہیں۔"

اس اداریے میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ معاصر "بنگلور" نے مہمان نوازی کے آداب کا خیال نہیں رکھا۔ ہم نے اپنے ہاں کے صرف تین شاعر بھیجے تھے، آپ ان کو بھی برداشت نہیں کر سکے تو پھر آپ سے کیا توقع رکھی جائے۔ حضرت رئیس امروہوی کے بارے میں آپ لکھتے ہیں کہ "سنتے آئے تھے کہ وہ بڑے بلند پایہ شاعر ہیں لیکن ہمارے لئے تو وہ نام بڑے اور درشن چھوٹے والا مقولہ ثابت ہوئے۔" آپ سنتے آئے تھے اور ہم مسلسل دیکھتے چلے آرہے ہیں کہ حضرت رئیس واقعی بلند پایہ شاعر ہیں۔ ان کا نام بھی بڑا ہے۔ اور درشن بھی بڑے ہیں۔ آپ نے ان کے بارے میں رائے قائم کرنے میں جلد بازی کا مظاہرہ کیا ہے۔ بہرحال یہ غنیمت ہے کہ آپ نے باقی دو شاعروں پر "نام چھوٹے اور درشن بڑے" کی پھبتی نہیں کسی۔ ہاں صاحب یہ تو بتایئے کہ آپ نے حضرت رئیس کو "مقولہ" کیسے بنا دیا۔ اطلاعاً عرض ہے کہ وہ بھی ہماری اور آپ کی طرح انسان ہیں "مقولہ" نہیں ہیں۔

جناب اختر فیروز کے بارے میں معاصر مذکور نے جو کچھ لکھا ہے، ہمیں اس پر سخت اعتراض ہے۔ ہمیں ان الفاظ سے خاص طور پر دلی صدمہ پہنچا ہے... "وہ کسی رائٹرز گلڈ کے سیکریٹری ہیں، ہوں گے، مگر شاعر بالکل نہیں کیونکہ انہوں نے جو کلام سنایا وہ بے وزن و بے معنی و بے ربط رہا"۔ عرض ہے کہ اختر فیروز جس ادبی انجمن کے سیکریٹری ہیں اس کا نام "کسی رائٹرز گلڈ" نہیں بلکہ "مہران رائٹرز گلڈ" ہے۔ یہ اطلاع بھی غلط ہے کہ وہ شاعر بالکل نہیں ہیں۔ دو تین غزلوں کی حد تک ان کے شاعر ہونے کی گواہی تو ہم بھی دیں گے کہ ہر مشاعرے میں یہی غزلیں ہم نے ان کی زبان شعر ترجمان سے سنی ہیں۔ ان کے شعروں کو بے وزن بھی نہیں کہا جا سکتا، عروض والا وزن نہ سہی، شخصیت والا وزن ان کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو وہ تصویریں دیکھ لیجیے جو آئے دن اخبارات میں چھپتی رہتی ہیں۔ آدھی تصویر میں بیس آدمی نظر آتے ہیں اور باقی آدھی تصویر میں صرف جناب موصوف ہوتے ہیں۔ ویسے بھی اختر فیروز صاحب کی غزلوں کے سلسلے میں وزن کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جب نثری نظمیں لکھی جا سکتی ہیں تو نثری غزلیں کیوں نہیں لکھی جا سکتیں۔

موصوف کے کلام کو بے معنی اور بے ربط کہنا بھی بڑی زیادتی ہے۔ یہ تو ویسی ہی بات ہے جیسے کوئی شخص نمک پارے کھائے اور شکایت کرے کہ ان میں مٹھاس بالکل نہیں ہے یا لڈو کھائے اور شکوہ کرے کہ ان میں نمک کیوں نہیں ہے جب آپ مٹھاس کے بغیر نمک پارے کھا سکتے ہیں اور نمک کے بغیر لڈو کھا سکتے ہیں تو معنی اور ربط کے بغیر غزلیں کیوں نہیں پڑھ سکتے۔ ایسی غزلوں سے محظوظ ہونے کے لئے اعلیٰ ذوقِ سخن کی ضرورت ہے جو کم از کم ہمیں معاصر "بنگلور" کے اداریہ نویس میں نظر نہیں آتا۔

اداریے کا آخری حصہ پڑھ کر ہمیں جو ذہنی و روحانی کوفت ہوئی ہے، وہ بیان سے باہر ہے۔ یہ مطالبہ بے جا ہے کہ پاکستان سے صرف وہی شاعر بلائے جائیں جن کے منہ میں دانت ہوں اور تلفظ بھی اچھا ہو۔ گزارش ہے کہ ہمارے شاعر جیسے ہیں اور جس حالت میں ہیں، انھیں ویسے ہی اور اسی حالت میں قبول کرنا چاہیئے۔ ہمارے شاعر سچے شاعر ہیں۔ وہ ادب کے میدان میں بیساکھیاں لگا کر نہیں چلتے، خواہ یہ بیساکھیاں دانتوں کی ہوں یا تلفظ کی۔

ہمارے شاعروں پر معاصر مذکور نے یہ الزام بھی لگایا ہے کہ انہوں نے مفت کا مال بہت کھایا تھا، بیٹھنا دشوار ہو گیا تھا، اس لئے سارا وقت لیٹے پڑے رہے۔ زیادہ کھا لینے یا پی لینے (مراد پانی اور شربت سے ہے) کے بعد شعراء حضرات ہی نہیں، عام لوگ بھی آرام کرنا پسند کرتے ہیں۔ اگر ہمارے شعراء نے سرِ مشاعرہ تھوڑا سا آرام کر لیا یعنی لیٹے پڑ گئے تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔

معلوم نہیں "مفت کا مال" کے الفاظ کن معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں۔ جب کوئی شاعر مشاعرہ پڑھنے کے لیے کراچی سے بنگلور جائے گا تو جو کچھ وہ کمائے گا، وہ محنت کی کمائی ہوگی، مفت کا مال نہیں۔ مفت کا مال تو کراچی میں بھی ملتا ہے، لیکن ہمارے شعراء اس کو کبھی منہ نہیں لگاتے۔

ہمارے شعراء پر ناشائستہ اور غیر مہذب ہونے کا الزام لگایا گیا ہے۔ ہم اس الزام کو بھی رد کرتے ہیں بلکہ ایک عدد جوابی الزام پر عائد کرتے ہیں کہ آپ کے جو ادیب یہاں آتے ہیں، وہ بھی کچھ کم نہیں کرتے۔ ابھی پچھلے دنوں سلمیٰ صدیقی تشریف لائی تھیں۔ انہوں نے آتے ہی ہمارے نامور شاعر اور بلند مرتبہ ایڈیٹر جناب صہبا لکھنوی کے خلاف ایک عدد اخباری بیان جاری کر دیا جس میں اُن پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے کرشن چندر کی جو کتابیں چھاپی تھیں، اُن کی رائلٹی کا حساب نہیں دیا۔ صہبا صاحب چاہتے تو اس الزام کا سخت جواب دے سکتے تھے اور کہہ سکتے تھے کرشن چندر میرا دوست، حساب دوستاں در دل، آپ کون ہیں جو حساب مانگتی ہیں۔ لیکن صہبا صاحب نے شرافت کا ثبوت دیا اور خاموش رہے۔ (صہبا صاحب کا اصلی نام شرافت علی ہے، اس لیے شرافت کا ثبوت انہیں مجبوراً بھی دینا پڑتا ہے) سلمیٰ صدیقی نے جب یہ دیکھا کہ صہبا صاحب پر کوئی اثر نہیں ہوا تو انہوں نے روانگی کے وقت اُن کے خلاف ایک اور اخباری بیان جاری کر دیا۔ یہ بیان "اخبار خواتین" کے ۱۲ جنوری کے شمارے میں چھپا ہے۔ چونکہ یہ اخبار صہبا صاحب نہیں پڑھتے اس لیے سلمیٰ صدیقی کا بیان ہم اپنے کالم میں شامل کر رہے ہیں کہ ہمارا کالم موصوف کی نظر سے باقاعدگی سے گزرتا ہے جس کے لیے ہم اُن کے ممنون ہیں۔ سلمیٰ صدیقی فرماتی ہیں:

"میں اُن سے (صہبا لکھنوی سے) کبھی نہیں ملی تھی، کرشن جی انہیں اتنا دوست کہتے تھے۔ یقیناً وہ ہوں گے بھی۔ ان دونوں میں خط و کتابت رہتی تھی۔ میں نے اُن کے کچھ آخری خطوط دیکھے تھے۔ ان میں کچھ حساب کتاب تھا۔ مگر انہوں نے لکھا کہ تم ابھی کچھ نہ کرو، بس اپنا ادارہ استوار کرو۔ میں جب کراچی آئی تو ملنے کے لیے انہیں اطلاع کرا دی۔ دوسرے ہی دن اُن کا فون آیا، کہنے لگے میں نے ۱۹۶۵ء کے بعد سے کرشن کی کوئی کتاب نہیں چھاپی اور ساری ادائیگی کر دی ہے۔ میں نے اُن سے کہا، میں اس کی بات ہی نہیں کر رہی۔ میں تو صرف ملنے آئی ہوں، پھر وہ ملنے آئے، پانچ سو روپے لیتے آئے کہ سر دست یہ رکھ لیجیے، بڑی مشکلوں سے لایا ہوں یہاں حالات بہت خراب ہیں۔ ۱۹۶۵ء کے بعد سے کوئی کتاب نہیں چھاپی اور جو پہلے کی ہیں، وہ گودام میں پڑی ہیں۔ میں نے اُن سے کہا آپ میری ملاقات کو کاروباری نہ سمجھیں یہ پیسے رکھیں۔"

سلمیٰ صدیقی کا یہ بیان پڑھ کر ہمیں دکھ ہوا کہ انہوں نے صہبا لکھنوی جیسے باعزت شہری اور نیک نام پبلشر کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ صہبا صاحب معاملات کے بہت کھرے ہیں۔ ادیبوں کو اُن کی نگارشات کا معاوضہ [illegible] دیتے ہیں، یہاں تک کہ غزل گو شاعروں کو بھی فی غزل کے حساب سے معاوضہ دیتے ہیں۔ استاد اختر انصاری کی طرح وہ غزل گو شاعروں کو رسالہ دی [illegible]

سے نہیں بھیجے۔ صہبا صاحب کی طرف کرشن چندر کی کوئی رقم باقی نہیں تھی۔ اگر کبھی حساب فہمی ہوئی تو کرشن چندر ہی کی طرف رقم نکلے گی۔ سلمیٰ صدیقی کو انہوں نے پانچ سو روپے محض مسافر نوازی کے خیال سے دینے چاہے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ محترمہ نے یہ رقم قبول نہیں کی۔ اگر خدانخواستہ وہ یہ رقم لے لیتیں اور پھر بیان بھی جاری کر دیتیں تو لوگ کہتے کہ رقم بھی گئی اور کمپنی کی مشہوری کو بھی نقصان پہنچا۔ اب کم سے کم رقم تو محفوظ ہے۔

بات بنگلور کے مشاعرے سے چلی تھی۔ صہبا صاحب کے ذکر کا کوئی موقع نہ تھا کہ وہ بنگلور کے مشاعرے میں تو کیا کراچی کے مشاعروں میں بھی نہیں بلائے جاتے۔ لیکن بھارت والوں پر جوابی الزام لگانے کیلئے ہمیں صہبا صاحب کا سہارا لینا پڑا کہ الزام تراشی میں وہ اکثر بڑے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ہاں تو اس کالم کے شروع میں ہم نے عرض کیا تھا کہ روزنامہ "بنگلور" کا اداریہ پڑھ کر پاکستان کے ادبی حلقوں میں حیرت کی لہر دوڑ گئی۔ اور شدید ردِعمل ہوا۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل باتیں سننے میں آئی ہیں۔

(۱) جب کسی پاکستانی ادیب کو کسی غیر ملک سے کوئی دعوت آتی ہے تو اکیڈمی آف لیٹرز سے باضابطہ اجازت لینی پڑتی ہے۔ کیا ان ادیبوں کو اکیڈمی نے اجازت دی تھی؟

(۲) اگر اکیڈمی نے اجازت دی تھی تو کس بنا پر؟

(۳) ان ادیبوں کو پاکستان کی نمائندگی کا مستحق کیوں سمجھا گیا؟

(۴) اگر یہ ادیب اکیڈمی کی اطلاع کے بغیر گئے تھے تو ان کو یہ حق کس نے دیا تھا کہ اپنے آپ کو مہران رائٹرز گلڈ اور پاک بھارت پریم سبھا کے عہدیداروں کی حیثیت سے متعارف کرائیں۔

کیا اکیڈمی آف لیٹرز اس سلسلے میں وضاحت کرنا پسند کرے گی؟

انٹرویو لینے والوں نے گفتگو کا آغاز اس سوال سے کیا کہ آپ نے شاعری کب اور کس سے متاثر ہو کر شروع کی۔ قتیل صاحب نے یہ جواب دیا: "متاثر تو شاعر اپنے ہی حالات سے ہوتا ہے اور اس اندر کے شاعر سے جو پہلے ہی سے کہیں چھپا بیٹھا ہوتا ہے، وہی متاثر کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ بچپن میں ہی اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے۔ اسکول کا زمانہ تھا۔ جب میں نے شاعری شروع کی میرے خیال میں میں ان دنوں پانچویں جماعت میں تھا۔"

ہمارے لیے یہ اطلاع حیرت کا باعث ہے کہ کسی زمانے میں قتیل صاحب کے اندر ایک شاعر چھپا بیٹھا تھا۔ اب تو اندر اور باہر، دونوں جگہ قتیل شفائی ہی نظر آتے ہیں۔ معلوم نہیں وہ شاعر کہاں گیا۔ اگر اب بھی کہیں موجود ہے تو اسے منظرِ عام پر ضرور آنا چاہیے۔ یہ انکشاف بھی خاصا دلچسپ ہے کہ قتیل صاحب نے اس وقت شاعری شروع کی جب وہ پانچویں جماعت کے طالب علم تھے اس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ قتیل صاحب نے کسی زمانے میں شاعری بھی شروع کی تھی، وہیں پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کرنے کا ثبوت بھی ملتا ہے (یہ نکتہ قتیل صاحب کے سوانح نگار کو نوٹ کر لینا چاہیے۔)

ایک سوال یہ بھی کیا گیا کہ آپ نے غزلیں بھی کہی ہیں نظمیں اور گیت بھی لکھے ہیں۔ آپ کے خیال میں آپ کا اصل میدان کون سا ہے۔ قتیل صاحب نے اس کے جواب میں اعتراف کیا کہ وہ غزل اور گیت میں زیادہ کامیاب رہے ہیں اور وجہ یہ بتائی کہ "غزل میں تھوڑا سا گیت لایا ہوں اور گیت میں تھوڑا سا تغزل"...... "تھوڑا سا" نہیں "بہت سا" کہیے کہ اسی وجہ سے تو یہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ غزل کون سی ہے اور گیت کون سا۔ قتیل صاحب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے غزل کو غزل اور گیت

ان کا دعویٰ ہے کہ فلمی دنیا میں ان سے اچھا شاعر کوئی نہیں گزرا

وان کے شعروں میں شعریت نہ بھی ہو تو ان کا خاص رنگ ضرور ہوتا ہے

اشتہارات دلوائیے اور اپنا نمبر نکلوائیے

ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی کی انجمن اتحادِ طلبہ کا سالانہ مجلّہ "نمودِ سحر" کے نام سے شائع ہوا ہے جو اس کالج کے طلبہ کے ذوقِ نظر اور ذوقِ ادب کا آئینہ دار ہے۔ ظاہری حالت ایسی کہ اسے بلاشبہ کتابت و طباعت کا شاہکار کہا جا سکتا ہے اور مندرجات ایسے کہ اسے ملک کے کسی بھی اچھے سے اچھے ادبی رسالے کے مقابلے پر پیش کیا جا سکتا ہے اس مجلّے میں یوں تو پڑھنے کے لائق بہت سی تحریریں ہیں لیکن ہمیں جناب قتیل شفائی کا انٹرویو بہت پسند آیا۔ یہ انٹرویو اتنا فکر انگیز اور شاعرانہ ہے کہ محض اس کی بنا پر قتیل صاحب کو شاعر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ موصوف کے دس عدد شعری مجموعوں کو پڑھنے کے بعد بھی جو لوگ انہیں شاعر ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، انہیں یہ انٹرویو ضرور پڑھنا چاہیے تاکہ وہ اپنی رائے تبدیل کر سکیں۔

کو گیت نہیں رہنے دیا، بلکہ "چیزے دگر" بنا دیا ہے مثلاً غزلوں میں انھوں نے ایسے ایسے مضمون باندھے ہیں کہ ان سے پہلے کسی شاعر کے خیال میں نہیں آئے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

گنگناتی ہوئی آتی ہیں فلک سے بوندیں
کوئی بدلی تری پازیب سے ٹکرائی ہے

پازیب پاؤں میں تھی اور بدلی آسمان پر۔ قتیل صاحب نے ان دونوں کو ٹکرا کر جو موسیقی پیدا کی ہے، وہ قابل توجہ ہے۔ صرف چشمِ تصور ہی کی مدد سے شعر سمجھ میں آسکتا ہے۔ اس انٹرویو میں کہیں کہیں قتیل صاحب نے ذہانت کا بھی ثبوت دیا ہے۔ ان سے ایک سوال یہ کیا گیا کہ ہندوستانی شاعر کلیم عاجز کو بعض لوگ میر ثانی بھی کہتے ہیں۔ کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں؟ قتیل صاحب

نے فرمایا۔ "نہیں صاحب، بالکل غلط الزام ہے۔ کلیم عاجز کو ان پر مقدمہ دائر کر دینا چاہیے۔ میں تو ان سے سخت مایوس ہوا ہوں"۔ اس جواب سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ قتیل صاحب کس سے مایوس ہوتے ہیں۔ میر سے یا کلیم عاجز سے۔ ہمارا خیال ہے کہ میر ہی سے مایوس ہوئے ہوں گے کہ انھیں کلیم عاجز کے رنگ میں شعر کہنے کا سلیقہ نہ آیا اور ساری عمر اپنے ہی رنگ میں کہتے رہے۔ بڑے شاعروں میں یہ برائی ضرور ہوتی ہے کہ وہ صرف اپنے ہی رنگ میں شعر کہتے ہیں۔ خود قتیل کا بھی یہی حال ہے شعروں میں شعریت نہ بھی ہو، رنگ ضرور ہوتا ہے۔

ایک سوال کے جواب میں جناب قتیل نے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ مشفق خواجہ، نظیر صدیقی اور ڈاکٹر وزیر آغا بحیثیت شاعر اوسط درجے کے بھی نہیں ہیں۔ انھیں چاہیے کہ شاعری ترک کر دیں۔ یہ خود ان کے لئے بھی اچھا ہوگا۔ عبادت بریلوی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ انھوں نے جب محسوس کیا کہ شاعری ان کے بس کا روگ نہیں تو اسے ترک کرنے میں جھجک محسوس نہیں کی"۔

قتیل شفائی نے ڈاکٹر وزیر آغا کے نام کے ساتھ مشفق خواجہ اور نظیر صدیقی کا نام لے کر بڑی زیادتی کی ہے۔ یہ ویسی ہی بات ہے جیسے کوئی قتیل صاحب کے نام کے ساتھ لاغر مرادآبادی کا نام لے کر یہ کہے کہ ان دونوں کو شاعری ضرور کرنی چاہیے کہ حکیم نے نسخے میں لکھا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا بحیثیت شاعر جس مرتبے پر فائز ہیں اس کو سمجھنے کے لئے محض شاعر ہونے سے کام نہیں چلتا۔ پانچویں جماعت کے بعد کے بھی کچھ تجربات کی ضرورت پڑتی ہے۔

مشفق خواجہ کی حد تک، ہمیں قتیل شفائی کی رائے سے اتفاق ہے کہ وہ واقعی اوسط درجے کے بھی شاعر نہیں ہیں خواجہ صاحب کا مجموعۂ کلام ہماری نظر سے گزرا ہے، اس میں سوائے کتابت و طباعت کی خوبیوں کے اور کوئی خوبی نظر نہیں آئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے محض شاعروں کی فہرست میں نام لکھوانے کی خاطر شاعری کی ہے۔ خدا اس قسم کے شوق سے ہم سب کو محفوظ رکھے۔

قتیل شفائی نے نظیر صدیقی کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ انھیں اوسط درجے کا شاعر مان لینے میں کوئی ہرج نہیں تھا۔ نظیر صدیقی کا قصور شاید یہ ہے کہ انھوں نے اپنی بعض تنقیدی تحریروں میں قتیل شفائی کا ذکر اچھے الفاظ میں نہیں کیا۔ نظیر صاحب جن شاعروں کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں، انہوں نے جب کبھی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا تو قتیل صاحب کو بھی ناراض نہیں ہونا چاہیے تھا۔ نظیر صدیقی کے پسندیدہ شاعر صرف تین ہیں۔ پروین شاکر، محبوب خزاں اور خود نظیر صدیقی۔ انھوں نے آج تک بقید ہوش و حواس کسی چوتھے شاعر کی تعریف نہیں کی تو وہ کسی پانچویں سوار کی تعریف کیسے کر سکتے تھے۔!

قتیل صاحب اس بات سے خوش ہیں کہ عبادت بریلوی نے شاعری ترک کر دی۔ موصوف کو عبادت بریلوی کی نثر پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا ورنہ وہ شاعری ترک کرنے پر خوشی کا اظہار نہ کرتے۔ اس پر ہمیں ایک مشہور ناول نویس کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ کسی محفل میں وہ فخریہ بیان کر رہے تھے کہ میں پہلے شاعری کرتا تھا۔ علامہ اقبال نے میرے اشعار دیکھ کر مشورہ دیا تھا کہ میں شاعری ترک کر دوں اور نثر لکھوں۔ اس دن سے میں نے شعر کہنا چھوڑ دیا اور نثر لکھنی شروع کر دی"... اس پر ایک صاحب نے کہا... "کاش آپ کی نثر بھی علامہ اقبال کی نظر سے گزر جاتی"۔

قتیل صاحب سے ایک سوال یہ پوچھا گیا۔ "عام تاثر یہ ہے کہ جب شاعر فلمی دنیا سے وابستہ ہو جاتا ہے تو تخلیق کے میدان میں اپنا مقام بنانے سے ناکام رہتا ہے۔ اس ضمن میں آپ کا کیا خیال ہے؟" قتیل صاحب نے جواب دیا۔ "میری ہیں کتابیں دس۔ فلمی دنیا میں آنے سے پہلے ایک تھی، نو اس کے بعد لکھیں۔ تو یہ دیکھئے میری تخلیق کے سوتے کہاں خشک ہوتے"۔

ہمارا خیال ہے کہ قتیل صاحب نے سوال کو پوری طرح سمجھا نہیں۔ سوال کا تعلق مجموعوں کی تعداد سے نہیں معیار سے ہے۔ بہرحال یہ خوشی کی بات ہے کہ قتیل صاحب نے لوگوں کو مایوس نہیں کیا جو قتیل صاحب سے اسی شاعری کی توقع رکھتے ہیں جو ان کے مجموعوں میں ملتی ہے۔

بمبئی
فن اور شخصیت
کی فخریہ پیش کش
سردار جعفری نمبر
نگراں: ڈاکٹر قمر رئیس مدیر: صابردت

FANN AUR SHAKHSIYAT
Presents
SARDAR JAFRI
Number

قتیل شفائی نے اس انٹرویو میں جو کچھ کہا ہے، وہ کسی نہ کسی سوال کے جواب میں کہا ہے لیکن ایک بات ایسی بھی ہے جو انھوں نے از خود ارشاد فرمائی ہے کہ یہ بات از خود ارشاد فرمانے ہی کے لائق ہے فرماتے ہیں "فلمی دنیا میں مجھ سے اچھا شاعر کوئی نہیں گزرا۔ یہ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں"۔ ہمیں قتیل شفائی سے پورا پورا اتفاق ہے۔ آرزو لکھنوی، ساحر لدھیانوی اور مجروح سلطان پوری وغیرہ نے فلمی گیت کہاں لکھے ہیں گھاس کاٹی ہے۔ فلمی گیت لکھنے کا فن قتیل شفائی سے شروع ہوا اور انھیں پر ختم ہو گیا..... خدا کا شکر ہے انھوں نے اپنے دعوے کو فلمی دنیا تک محدود رکھا، اگر یہ دعویٰ ادبی دنیا سے بھی متعلق ہوتا تو معلوم نہیں استاد اختر انصاری اکبرآبادی کی کیا حالت ہوتی کہ جن کا یہ دعویٰ ہے کہ ادبی دنیا میں ان سے اچھا شاعر نہیں گزرا۔ اختر انصاری اکبرآبادی کا دعوے اس لئے درست ہے کہ وہ مشاعروں میں جہاں دو چار اپنے شعر پڑھتے ہیں، وہاں دس بیس شعر اچھے شاعروں کے بھی سنا دیتے ہیں۔

صابردت ایک ہندوستانی ادیب ہیں اور بمبئی سے "فن اور شخصیت" کے نام سے ایک رسالہ نکالتے ہیں۔ پچھلے دنوں اس رسالے کا قتیل شفائی نمبر شائع ہوا تھا اس سلسلے میں قتیل صاحب سے پوچھا گیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ کسی پاکستانی رسالے نے آپ پر نمبر شائع نہیں کیا، یہ سعادت حاصل ہوئی تو ایک ہندوستانی رسالے کو۔ جناب قتیل نے اس کے جواب میں فرمایا، "بمبئی میں وسائل ایسے ہیں کہ کوئی بڑا نمبر نکالے تو اسے پریشانی نہیں ہوتی اور بمبئی میں تو غزل کی کافی قدر ہے۔ اب غزل کے لئے انھیں (صابردت کو) کچھ ناموں کی تلاش ہوئی تو مجھ پر نظر پڑی۔ انھوں نے یہ مناسب سمجھا ہوگا۔ کہ یہ نمبر چھاپیں گے تو اشتہارات بھی مل جائیں گے۔ مالی امداد بھی ہو جائے گی، بک بھی جائے گا۔ میرا تجزیہ اس نمبر کے سلسلے میں یہ ہے کہ چونکہ میں وہاں مقبول ہوں اور وہاں سہولت ہے اور بس۔ باقی رہی پاکستان کی بات تو یہاں خدا نے بڑی عزت دی ہے۔ مجھے کوئی شکوہ نہیں کہ یہاں (نمبر) کیوں نہیں چھپا۔ آخر پرچوں میں چھپتا رہتا ہوں۔ وہ عزت دیتے ہیں۔ یہی کافی ہے"۔

جناب قتیل کا بیان یقیناً درست ہوگا، لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہے، صابردت کا طریقۂ واردات یہ ہے کہ وہ جس شخص پر نمبر نکالتے ہیں، سرمایہ کاری کے لئے بھی اسی کو یا اس کے عزیزوں کو زحمت دیتے ہیں۔ کسی سے نقد کا معاملہ کرتے ہیں اور کسی سے یہ کہتے ہیں کہ اتنے کے اشتہار دلوا دو تو نمبر نکال دوں گا جو ان کی مطلوبہ رقم کے اشتہار دلوا دیتا ہے، اس کا نمبر چھپ جاتا ہے۔

صابردت نے سردار جعفری پر بھی نمبر شائع کرنے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن سردار جعفری نے اشتہار دلوانے سے انکار کر دیا لہٰذا یہ نمبر شائع نہیں ہوا۔ یادگار کے طور پر اس نمبر کا نرخنامہ اشتہارات باقی رہ گیا ہے جس کے پہلے صفحے کا عکس اس کالم کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ جس زمانے میں سردار جعفری نے صابردت کو اشتہار دلوانے سے انکار کیا تھا۔ اسی زمانے میں قتیل شفائی بمبئی پہنچ گئے اور یوں قتیل شفائی نمبر کی اشاعت کے لئے میدان ہموار ہو گیا۔ بعض باخبر لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ صابردت نے سردار جعفری نمبر کے لئے جو اداریہ لکھا تھا۔ اسی میں مناسب ترمیم کر کے قتیل شفائی نمبر کا اداریہ تیار کر لیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

رہی یہ بات کہ کسی پاکستانی رسالے نے قتیل شفائی نمبر کیوں نہیں نکالا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے ہاں صابر دت جیسی کاروباری سوجھ بوجھ رکھنے والا کوئی ایڈیٹر نہیں۔ بعض لوگوں میں اگر کچھ سوجھ بوجھ ہے بھی تو صرف اتنی کہ جس کی غزل چھاپی اسے رسالہ وی پی پی سے بھیج دیا۔

جناب قتیل سے ایک سوال یہ بھی کیا گیا کہ "کہا جاتا ہے کہ آپ ابتدائی دور میں احمد ندیم قاسمی سے بہت متاثر تھے، آخر کیوں؟" موصوف نے اس کا جواب ان الفاظ میں دیا۔ "میری شاعری کے کئی دور آئے۔ شروع شروع میں میں اقبال سے متاثر تھا۔ میں اور ساحر لدھیانوی، مجھے یاد ہے کہ ایک ساتھ چھپتے تھے۔ ڈیلی انقلاب میں۔ اس زمانے میں بہت سے لوگ اقبال کے رنگ میں لکھتے تھے۔ پھر بعد میں ہم لوگ جو ذرا الگ مزاج رکھتے تھے یعنی ساحر اور میں۔ ہم نے سوچا کہ ٹھیک ہے۔ ہم اقبال تو نہیں بن سکتے۔ ساحر، فیض سے متاثر ہو گئے اور میں قاسمی صاحب سے اور پھر بعد میں تیسرا دور جو آیا وہ یہ کہ میں نے سوچا کہ میں قاسمی بن گیا تو کیا حاصل۔ ساحر نے سوچا کہ میں فیض بن گیا تو کیا فائدہ۔ ظاہر ہے کہ جب زندگی کے تجربے شامل ہوتے ہیں تو آدمی اپنا علیحدہ راستہ متعین کرتا ہے۔"

قتیل صاحب نے جناب احمد ندیم قاسمی کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ انھوں نے اقبال کے رنگ میں لکھنا اس لئے چھوڑا کہ وہ اقبال نہیں بن سکتے تھے لیکن قاسمی صاحب کے اثر سے اس لئے آزاد ہوئے کہ اگر وہ قاسمی بن بھی گئے تو کیا حاصل۔ اس موقع پر وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ میں قاسمی صاحب کی شاعری کے اثر سے اس لئے آزاد ہوا کہ میں قاسمی نہیں بن سکتا تھا۔ حیرت ہے کہ ایک طرف تو قاسمی صاحب کو قتیل صاحب اپنا ادبی رہنما تسلیم کرتے ہیں اور دوسری طرف قاسمی صاحب جیسے شعر کہنے کو لا حاصل سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ـــــ ملامتوں کے درمیان۔

چند ہفتے قبل ہم نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے سفرنامے کا ذکر کیا تھا جس کا ایک حصہ "ادبِ لطیف" میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت تک ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہ سفرنامہ کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے اور "ادبِ لطیف" میں اسی کتاب سے بغیر حوالے کے استفادہ کیا گیا تھا۔ یہ سفرنامہ جس کا نام "سفر آشنا" ہے۔ اِس وقت ہمارے سامنے ہے جو مختصر بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ ڈاکٹر نارنگ نے بڑی خوبصورت نثر لکھی ہے اور کہیں کہیں تو نثر میں شاعری بھی کی ہے۔ مثلاً یہ جملہ ہمیں ایک اچھے شعر کی طرح پسند آیا۔ "ہر سفر ایک نئی تنہائی سے شروع ہوتا ہے"۔

اس سفرنامے میں ڈاکٹر نارنگ نے جہاں صلاح الدین پرویز کی شاعرانہ صلاحیتوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے وہیں اپنے بعض حریفوں کو بھی خوب مزے لے لے کر یاد کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ڈاکٹر محمد حسن کا نام لئے بغیر لکھتے ہیں۔ "عشق کی تقویم میں ماہ و سال کے علاوہ اور زمانے بھی ہیں۔ جو بھی کیا ٹھیک کیا۔ جیسے بھی گزری، خوب گزری...... کیسی کیسی ملامتوں کے درمیان بسر کی لیکن ہمت نہیں ہاری۔ دہلی کے ان کرم فرماؤں کی بھی یاد آئی جنھیں خدا نے سب کچھ دیا ہے لیکن وہ اپنی صلاحیتوں کو حسد اور رقابت کی راہ میں فیاضی سے لٹاتے رہتے ہیں جو بڑی بڑی انسان دوست تحریکوں سے وابستہ ہیں لیکن جنھیں سازشیں بونے اور نفرتیں کاٹنے میں کمال حاصل ہے کیونکہ ذہنی کشادگی اور انسانیت سے ان کی صاحب سلامت بھی نہیں۔ اللہ ان پر رحم کرے اور انھیں جہنم کی آگ سے محفوظ رکھے"۔

ڈاکٹر نارنگ نے اپنی یونیورسٹی کے بعض ساتھیوں کو بھی فراموش نہیں کیا اور انھیں "گدھے جیسی کسی احمق چیز" کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ انھیں اپنے ایک دوست کے گھر پر کمپیوٹر کے ذریعے تحلیل نفسی کے ایک پروگرام میں حصہ لینے کا موقع ملا۔ فرماتے ہیں ...... "ایک مزے کا پروگرام تحلیلِ نفسی کا تھا جسے پرنسٹن کے کسی ماہرِ نفسیات نے تیار کیا تھا۔ اس میں بڑے دلچسپ سوالات تھے اور بتدریج سوالوں کا دائرہ اتنا تنگ ہوتا جاتا تھا کہ بالآخر جواب خود بخود سامنے آجاتا تھا۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ کسی چیز کا تصور کیجئے۔ ہندوستان میں یونیورسٹیوں کی زندگی میں جس نوعیت کے بعض کرداروں سے سابقہ رہتا ہے میں نے یکلخت کئی جانداروں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ پھر پوچھا گیا کہ اس کے سینگ ہیں۔ میں نے کہا نہیں۔ پھر پوچھا گیا۔ اس جاندار کی خوراک کیا ہے، وہ گوشت کھاتا ہے کہ گھاس، سواری کے قابل ہے کہ نہیں، دولتی جھاڑتا ہے، دودھ دیتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ آخر میں کہا گیا کہ آپ نے گدھے جیسی کسی احمق چیز کے بارے میں سوچا تھا۔ جواب اثبات میں تھا۔

قارئینِ گرامی! یہ اطلاع تو آپ کو مل ہی چکی ہوگی کہ کراچی یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے پاک و ہند مشاعرے میں شرکت کی غرض سے جو بھارتی شعراء کراچی آئے۔ ان میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، خمار بارہ بنکوی (؟) — ان میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، فنا نظامی کانپوری، بشیر بدر، افتخار امام وغیرہ کے نام شامل تھے۔ اس مشاعرے کے بعد شہر میں مشاعروں اور شعری محفلوں کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ انجمن ساداتِ امروہہ نے بھی ایک مشاعرہ برپا کیا۔ چند ہندوستانی اور پاکستانی شعراء کو سلطان جمیل نسیم نے بھی اپنی قیام گاہ پر مدعو کیا۔ اور ایک شعری محفل سجا ڈالی۔ ہندوستانی شعراء میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور بشیر بدر کے علاوہ علی جواد زیدی بھی اس محفل میں شریک تھے۔ واضح رہے کہ زیدی صاحب کراچی یونیورسٹی کے مشاعرے میں شرکت کی غرض سے نہیں بلکہ نجی دورے پر کراچی آئے ہوئے ہیں۔

سلطان جمیل نسیم کے ہاں منعقد ہونے والی شعری محفل کی صدارت کراچی پورٹ ٹرسٹ کے چیئرمین اور بقول تاجدار عادل سمندر کے شہر کے ایک سمندر صفت انسان ریئر ایڈمرل محمد اسحاق ارشد نے کی۔ اس محفل میں شعرائے کرام نے جس ترتیب سے اپنا کلام سنایا۔ اسی ترتیب سے ان کا ایک ایک شعر بطورِ نمونۂ کلام پیشِ خدمت ہے۔ راغب مراد آبادی نے چونکہ غزل کی بجائے رباعیاں سنائیں۔ اس لئے ان کی ایک رباعی درج ہے ملاحظہ فرمائیے۔

حادثہ روز نیا واقعہ تھا روز وہی
زخم ہر لمحے نئے درد ملا روز وہی

(تاجدار عادل)

وہم اک باہری حوالہ ہے
اور اندر گمان بولتا ہے

(نقاش کاظمی)

کارواں تو خیر کیا دیکھے گا مڑ کر تیری سمت
تو غبارِ کارواں کو دیکھتا رہ جائے گا

(عالمتاب تشنہ)

دھوپ نکلے گی تو ابھریں گے خد و خال اس کے
وہ تو سایہ ہے درختوں میں چھپے گا کب تک

(طارق سبزواری)

اپنی مجبوری کو ہم دیوار و در کہنے لگے
قید کا ساماں کیا اور اس کو گھر کہنے لگے

(شبنم رومانی)

پہچان اپنی ہم نے مٹائی ہے اس طرح
بچوں میں کوئی بات ہماری نہ آئے گی

(بشیر بدر)

مریخ ہے گرد گرد واپس آجا
صحرائے زحل ہے سرد واپس آجا
یہ جملہ کرے اگر ہیں بے آب و گیاہ
اے فکرِ خلا نورد واپس آجا

یہ میرا عکس ہے آئینے میں کہ دشمن ہے
اداس، تشنہ، سراسیمہ، بے خبر، تنہا

(علی جواد زیدی)

کبھی دیوانہ بنے ہیں کبھی فرزانہ بنے
ہم کو کیا کیا نہ بنایا گیا کیا کیا نہ بنے

(مہندر سنگھ بیدی سحر)

● بھاگلپور (بھارت) سے مناظر عاشق ہرگانوی کی اِدارت میں شائع ہونے والے رسالے "کوہسار" کا تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے۔ یہ رسالہ آزاد غزل کے فروغ کے لئے کام کر رہا ہے۔ اس کے زیرِ نظر شمارے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں اردو کے ممتاز محقق قاضی عبدالودود کے تین شعر اور ہندوستان کے صفِ اوّل کے اداکار امیتابھ بچن کی دو مختصر نظمیں شریکِ اشاعت ہیں۔ واضح رہے کہ امیتابھ بچن کے والد پروفیسر ہری ونش رائے بچن کا شمار ہندی کے اعلیٰ پائے کے شعراء میں ہوتا ہے۔

سپاہی کی سرگزشت

انیس احمد خاں

کھڑک سنگھ ایک نیک شریف ایمان دار انسان تھے۔ لیکن لوگ باگ ان کی ان تمام خوبیوں کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے — کیونکہ — وہ پولیس مین تھے۔ ان کے جنّتی باپ نے انھیں ایک شریف شہری بنانے کی پوری کوشش کی تھی۔ اس کے لئے ان کو جنگی کے اسکول کے علاوہ ایک ٹیوشن بھی لگوا دیا گیا تھا۔

لیکن ایک دن جب ماسٹر جی نے حساب کے

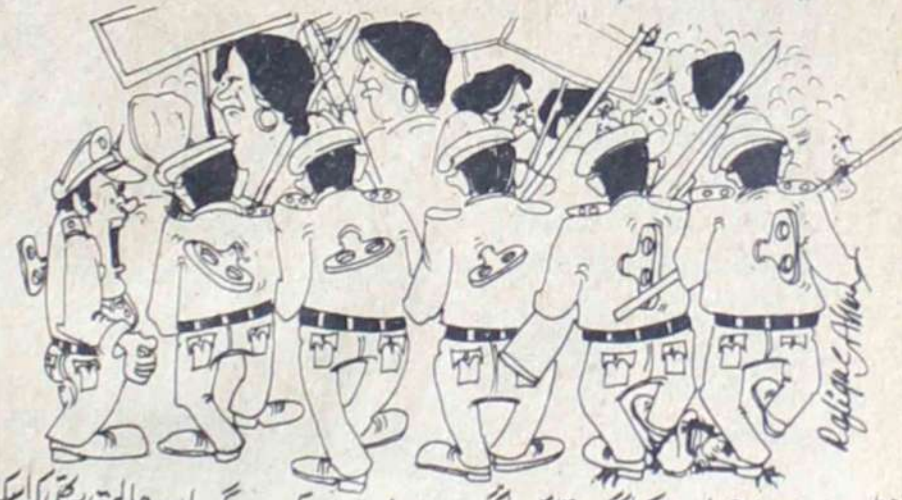

گھنٹے میں ان سے پوچھا۔ "کھڑک بتاؤ۔ اگر میں نے تمھیں ایک روپیہ دیا اور تمہارے پتاجی نے تمھیں ایک روپیہ دیا تو تمھارے پاس کُل کتنے روپے ہو جائیں گے؟"

"ڈھائی روپے۔" ننھے کھڑک نے جواب دیا۔

"وہ کیسے؟" ماسٹر صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

"کیونکہ آٹھ آنے میرے پاس پہلے سے ہی موجود ہیں۔" انھوں نے معصومی سے کہا۔

بات یہیں تک رہ جاتی تو ماسٹر صاحب ٹال دیتے۔ لیکن آگے جو ہوا وہ اس سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ ماسٹر صاحب نے سوچا بچہ بھولا ہے اور اپنے بھولے پن میں ایسے جواب دے رہا ہے۔ لہٰذا انھوں نے دوسرا سوال کیا۔

"اچھا یہ بتاؤ — میں نے موہن نے اور سلطان ہمن نے دو دو انڈے تمھیں دیئے۔ تو کل مِلاکر میں نے کتنے انڈے دیئے؟"

"ایک بھی نہیں۔" کھڑگ نے کہا۔

"کیوں؟"

"ماساب! کیا آپ مُرغی ہیں جو انڈے دیں گے۔" کھڑگ نے لجاتے ہوئے کہا۔

اس دن ماسٹر جی نے کھڑک سنگھ کو خوب مارا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے اسکول جانا بند کر دیا۔ اور فیصلہ کیا کہ اب زندگی میں اسکول کا مُنہ نہیں دیکھیں گے۔ اب حالت یہ تھی کہ اسکول نہیں جاتے تھے تو باپ مارتا تھا اور اگر اسکول پہنچ جاتے تو ماسٹر پیٹتا تھا۔ اسی ماحول میں پلے بڑھے کھڑگ سنگھ کی رگ رگ میں مار پیٹ بس گئی۔ آج کل وہ وراثت میں ملے اس فن کے بہترین نمونے ہر شہری پر دل کھول کر آزماتے۔ ویسے عام انسانوں کی طرح کھڑگ سنگھ پولیس مین کے بھی بال بچے تھے۔ یہ بات الگ تھی کہ انھیں ان سب سے زیادہ اپنی خاکی وردی سے محبت تھی جو ان کے جسم پر سوتن کی طرح چوبیس گھنٹے چپکی رہتی۔

ہر پولیس والے کی طرح ان کی ڈیوٹی بھی چوبیس گھنٹے کی ہوتی تھی۔ لیکن پگار دی۔ ڈھاکے تین پات۔ جس میں بیوی بچّوں کا تو کیا خود ان کا اپنا پیٹ بھرنا مشکل ہوتا تھا۔ پھر نوکری بھی ایسی تھی جس میں ترقی اور بڑھوتری کے چانس ہی کم ہوتے ہیں۔ لہٰذا ڈیوٹی بھی بڑے آرام سے دیتے تھے۔

ایک مرتبہ جہاں وہ ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔ وہاں چوری ہو گئی۔ چور تو چوری کر کے بھاگ نکلا لیکن محلّے والوں نے کھڑک سنگھ کو دھر دبوچا۔ جو ایک بنچ پر لمبی تانے سو رہے تھے۔ لوگوں نے انھیں جگا کر کہا۔ "چور وہاں چوری کر رہا اور آپ یہاں آرام۔"

"ہم دونوں اپنی ڈیوٹی نبھا رہے ہیں۔" کھڑگ نے انگڑائی لے کر کہا۔

"مگر ہمارے جان و مال کی حفاظت کرنا آپ کا فرض ہے۔"

"بھائی، جب تم اپنے مال کی حفاظت نہیں کر سکتے تو بھلا میں ڈھائی سو روپلّی کا سپاہی کیا کھا کر اس کی حفاظت کر سکتا ہے؟"

"یہ چوری آپ کی ڈیوٹی کے موقع پر ہوئی ہے۔ لہٰذا آپ کو اس کا جواب دہ ہونا پڑے گا۔" غصّے میں بھرے ہوئے محلّے والے بولے۔

"آپ کے یہاں چوری کتنے بجے ہوئی؟"

"ساڑھے گیارہ بجے۔"

"میری ڈیوٹی تو گیارہ بج کر پندرہ منٹ یعنی سوا گیارہ بجے ہی ختم ہو گئی تھی۔ سمجھے! اب اس کا ذمّہ دار میں نہیں بلکہ پیارے لال ہے۔"

"کون پیارے لال؟" ایک محلّے والا بولا۔

"جس کی ڈیوٹی سوا گیارہ بجے شروع ہوتی ہے۔" کھڑک سنگھ کھینی رگڑ کر مُنہ میں دباتے ہوئے بولے۔

"لیکن پیارے لال تو ڈیوٹی پر اب تک بھی نہیں آیا؟" جب کہ ساڑھے بارہ بج چکے ہیں۔"

"اور وہ آئے گا بھی نہیں، کیوں کہ آج ہی وہ اپنی سالی کو سُسرال چھوڑنے گیا ہے۔"

"تو آپ یہاں کیا کر رہے تھے؟" غصے میں بھرے ہوئے محلّے والوں نے اس سے پوچھا۔

"دیکھا نہیں سو رہا تھا۔" انھوں نے اطمینان سے جواب دیا۔

ان اطمینان بھرے جوابوں کو سُن کر بھیڑ

نے ان کو پیٹنا شروع کر دیا۔ اور اتنا پیٹا کہ ان کی دونوں ٹانگیں توڑ کر رکھ دیں۔

کھڑک سنگھ کو اس حادثے کے بعد اسپتال میں بھرتی کرا دیا گیا۔ ایک مہینے بعد جب ان کی ٹانگوں کا پلاسٹر کھلا تو ڈاکٹروں نے ان کو کچھ دنوں کے لئے سیڑھیاں چڑھنے اترنے کو بالکل منع کر دیا۔ اگلے ایک مہینے بعد جب وہ ڈاکٹر کے پاس دوبارہ چیکنگ کو گئے تو ڈاکٹر نے کہا۔ "کھڑک سنگھ اب آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ اب آپ سیڑھیاں اُتر چڑھ سکتے ہیں۔"

"انھوں نے کہا۔ شکریہ ڈاکٹر صاحب" میں بھی پائپ کے ذریعے چڑھتے اُترتے کافی پریشان ہو گیا تھا۔

ایک مہینے کی بیماری اور ایک مہینے کے آرام نے کھڑک سنگھ پولیس مین کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ ویسے کر تو ہر چوتھے درجے کے سرکاری نوکر کی ٹوٹی ہی رہتی ہے۔

کھڑک سنگھ نے جس دن دوبارہ ڈیوٹی جوائین کی تو اپنا جیب خرچ لینے کے لئے بازار کی طرف جا نکلے۔ وہاں جا کر پتہ لگا کہ ان کی غیر حاضری میں کوئی دوسرا ان کا جیب خرچ لے اُڑا ہے۔ اپنا حق اس طرح مارا جاتا دیکھ کر انھیں بہت غصہ آیا اور اسی غصے میں انھوں نے اپنا سارا ڈسپلن ریڑھی والوں پر نافذ کر دیا۔ کچھ کو ڈنڈے مارے۔ کچھ کی ریڑھی پلٹ دی اور سڑک پر اپنی روزی روزی کی بات دیکھتے گئی سائیکل ورکشاؤں کی ہوا نکال دی۔ اس پر بھی جب انھیں تسلی نہ ہوئی تو سڑک پر بچوں بیچ لیٹے ہوئے ایک کتے پر کچھ دیر تک اندھا دھند ڈنڈے برسائے پھر واپس تھانے اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گئے۔

لیکن مصیبتیں کہہ کر نہیں آتیں۔ جب آتی ہیں تو ڈی۔ ٹی۔ سی کی بس کی طرح کھچا کھچ بھری ہوتی ہے۔ کھڑک سنگھ کا آج کا دن بھی کچھ ایسا ہی تھا جیسے ہی انھوں نے صبح سے بھولے ہوئے شام کو تھانے میں قدم رکھا تو تھانے دار کو اپنے انتظار میں کوہِ قضا بنے ہوئے پایا۔ کیونکہ ابھی ابھی کوئی نیتا جو اپنا بکرا گم ہو جانے کی رپورٹ لکھوانے آیا تھا رپورٹ لکھنے والے کو غیر حاضر پا کر تھانے دار کو گالی گلوچ کے ساتھ پولیس والوں کے فرائض سمجھا کر گیا تھا۔ کھڑک سنگھ کو دیکھتے ہی تھانے دار نے پوچھا۔

"صبح سے کہاں تھے؟"

"ڈیوٹی پر"

"لیکن تمھاری ڈیوٹی تو یہاں روزنامچہ لکھنے پر لگی تھی۔"

"روزنامچہ لکھتے لکھتے تھک گیا تھا۔ لہٰذا تھکان اتارنے کے لئے مارکیٹ کی طرف نکل گیا تھا۔"

"اچھا۔ اچھا! کوئی بات نہیں۔" تھانے دار نے کہا۔

"ذرا آج کا اخبار تو دینا۔ سُنا ہے اس میں پولیس والوں کی تعریف چھپی ہے۔"

"وہ تو کل سے ہی تلاش کر رہا ہوں جناب۔ مل ہی نہیں رہا ہے۔" کھڑک سنگھ نے بے خیالی میں جواب دیا۔

"تھانے دار ان کی اس قدر غیر حاضر دماغی دیکھ کر کچھ دیر تک تو دنگ رہا۔ پھر جو اس نے انھیں جھاڑ پلانی شروع کی تو اتنی پلا دی کہ کھڑک سنگھ کے پیر بھی غصے میں لڑکھڑاتے لگے۔ لیکن ڈسپلن میں بندھے وہ بے چارے تھانے دار کا کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا اسے بھی اپنی ڈیوٹی کا ایک حصہ سمجھ کر دوسری چیزوں کی طرح چُپ چاپ سہہ گئے۔

اسی وقت وہی نیتا اپنے بچے کو گود میں اٹھائے ہوئے آئے اور مُسکراہٹوں کے پھول بکھیرتے ہوئے تھانے دار سے بولے۔ "دروغہ جی معاف کرنا۔ میرا کھویا ہوا بکرا مل گیا ہے۔"

"تو آپ نے اسے گود میں کیوں اُٹھا رکھا ہے"۔ نیتا اور دروغہ دونوں نے غریب کھڑک سنگھ پولیس مین کو گھور کر دیکھا۔ ادھر دروغہ جی نے بات سادھنے کی غرض سے کہا۔

"کہاں ملا آپ کا — وہ بکرا؟"

"اجی کیا بتائیں! میری بیوی کو اس سے بہت محبّت ہے۔ آج بھی وہ جب اپنی اماں سے ملنے رگھوبیر نگر جا رہی تھی تو بکرے کو بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ اور میں نے سمجھا کہ وہ کہیں گم ہو گیا۔"

"خیر یہ اچھا ہوا کہ آپ کا بکرا مل گیا ورنہ آپ کے لئے ہم میں سے کسی ایک کو بکرا بننا پڑتا۔ آپ نیتا جو ٹھہرے" کھڑک سنگھ نے جل کر کہا۔

"کھڑک سنگھ!" تھانے دار نے اُنھیں ڈانٹا اور فوراً باہر جانے کو کہا۔

کھڑک سنگھ باہر آ کر تھانے کی ایک بینچ پر پسر گئے اور سوچنے لگے۔ سالی! یہ پولیس کی نوکری بھی بالکل بکرے کی طرح ہے۔ مصیبت کسی پر پڑے قربانی اسی کی دی جاتی ہے۔

...... اور اس مہینے کی صرف تنخواہ میں ہی کس طرح گذارہ ہوگا۔ سوچتے ہوئے اونگھنے لگے۔

• • •

- چنگاری اب نہ صرف یہ کہ باقاعدہ شائع ہو رہا ہے بلکہ باقاعدگی سے پوسٹ بھی کیا جاتا ہے۔ اگر آپ کو کوئی شمارہ نہیں ملا تو ہمیں ایک پوسٹ کارڈ لکھ دیجئے۔ اطلاع ملتے ہی رسالہ ارسال کر دیا جائے گا۔
- اگر آپ نے کوئی کتاب چھاپی ہے تو اس کی تفصیلات ارسال کر دیجئے ہم تازہ مطبوعات میں شائع کر دیں گے۔ (اس کے لئے کتاب بھیجنا ضروری نہیں۔ لیکن اگر آپ تبصرہ چاہتے ہیں تو دو کاپیاں بھیجئے۔
- اگر آپ کے پاس اشاعت کے لئے کوئی مسودہ ہے تو اس کی بھی تفصیلات لکھئے۔ ممکن ہے ہم آپ سے تعاون کر سکیں۔
- چنگاری میں ہم تمام کلچرل سرگرمیوں کی رپورٹ شائع کریں گے۔

اور ایک سب سے اہم بات

آئندہ شمارے سے چنگاری ایسی معلومات بھی فراہم کرے گا جن سے آپ کو روزگار حاصل کرنے میں سہولت ہو جن سے آپ کی شخصیت کی تعمیر اور ترقی میں مدد ملے۔

چنگاری کے پانچ خریدار بنانے والوں کو چنگاری کے بارہ شمارے مُفت بھیجے جائیں گے۔

چنگاری ۳/۱۴۱۰-۱۱ رام نگر شاہدرہ دہلی

ہمارے مسائل

ذاکرہ خانم

میں نے سید حامد صاحب اور ڈاکٹر احسان اللہ خاں کے خیالات کا مطالعہ کیا۔ سید صاحب ہندوستانی مسلمانوں کو نیک عمل کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی میں ان کی بھلائی تصور کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان جفاکشی اور ایمانداری کی جانب کیوں راغب نہیں ہوتا ہے جب کہ یہ اسلام کے بنیادی ستون ہیں۔ اس کی وجہ ان کی نظر میں یہ ہے کہ جب بھی انصاف کا فقدان ہوتا ہے جفاکشی اور ایمانداری کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ دیانت داری کے مقابلے میں بدعنوانی کا دور دورہ ہوتا ہے۔

میں بھی ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر بہت دنوں سے غور کرتی رہی ہوں اور اتفاق سے ایک دن میں جنوب مشرق ایشیا پر ایک کتاب پڑھ رہی تھی اس میں ایک امریکی شہری اور ایک جنوبی ویتنامی تاجر کی گفتگو تحریر تھی۔ یہ گفتگو اس وقت کی ہے جب کثیر امریکی فوجیں جنوبی ویتنام میں موجود تھیں میں اس کو یہاں پر درج کرنا چاہتی ہوں تاکہ مسئلہ کا ایک اور پہلو سامنے آسکے۔

امریکی شہری نے تاجر سے دریافت کیا کہ آخر وہ اتنا بدعنوان کیوں ہے اس نے فوراً اس کا انکار کیا اور پھر کہا کہ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں ہے تو مجھے اپنے ملک میں تجارت کا موقع دیجئے پھر دیکھئے گا کہ میں آپ کے تاجر سے کہیں زیادہ دیانت دار ہوں اس موقع پر امریکی شہری چونکا اور دریافت کیا کہ آخر وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے تاجر نے جواب دیا کہ ہر تاجر کی طرح میں بھی اپنی دولت اور محنت کو اس طرح استعمال کرتا ہوں کہ اس سے زیادہ سے زیادہ دولت جمع ہو سکے۔ آپ کے ملک میں دیانت داری کا ماحول ہے لہذا وہاں پر بدعنوان تاجر کامیاب نہیں ہو سکتا ہے اس کے برخلاف ہمارے ملک میں بدعنوانی کا دور دورہ ہے لہذا یہاں پر کوئی بھی دیانت دار بشمول تاجر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا ہے۔

مندرجہ بالا واقعہ ایک غیر ترقی یافتہ ملک کا رہا اب میں ایک ترقی یافتہ ملک کا ایک واقعہ پیش کروں گی تاکہ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنی راہ متعین کرنے میں آسانی ہو۔

میں نے امریکی نگرو پر ایک رپورٹ پڑھی تھی جس میں پوری تفصیل کے ساتھ یہ دکھایا گیا تھا کہ کس طرح افریقی افراد امریکہ کے جنوبی حصے میں غلام کی حیثیت سے لائے گئے تھے اور عرصے تک وہ وہاں پر غلام کی حیثیت سے کام کرتے رہے لیکن جب امریکہ میں غلامی ختم کردی گئی تو یہ لوگ اگرچہ آزاد ہو گئے تھے مگر ان کو اپنی محنت کی پوری اجرت نہ ملتی تھی۔ انھوں نے اس کو کافی عرصے تک برداشت کیا مگر جب نئی نسل آئی تو اس نے ۱۹۶۷-۶۸ء میں ناانصافی کے خلاف بغاوت کردی اور پورے ملک میں توڑ پھوڑ کی کارروائی جاری کردی۔ مگر چونکہ امریکہ ایک ترقی یافتہ ملک ہے لہذا اس نے طاقت سے اس کو دبانے کی کوشش نہیں کی جیسا کہ غیر ترقی یافتہ ممالک میں ہوتا ہے بلکہ اس بغاوت کے وجوہات کو معلوم کرکے مناسب اقدام اٹھایا گیا اور ہر میدان میں باصلاحیت نگرو افراد کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا گیا لیکن اگر یہی واقعہ ایک غیر ترقی یافتہ ملک میں ہوتا تو ہونہار اور باصلاحیت افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا اور چند نااہل خوشامدی افراد کو کچھ اچھے عہدے دے کر اس گروہ کے زخموں کی مرہم پٹی کردی جاتی اور عرصے دراز تک ان سے کم اجرت پر کام لیا جاتا۔

یہ تو موجودہ دور کے احوال تھے اب میں یہ بتانے کی کوشش کروں گی کہ زمانہ قدیم سے کیا ہوتا آیا ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات واضح طور سے سامنے آتی ہے کہ ہزاروں سال تک طاقتور طبقہ کمزور طبقے کے لوگوں کو یہ نصیحت کرتا آیا ہے کہ وہ جفاکشی اور ایمانداری سے کام کرے اور یہی اس کے دین و ایمان کا جز کامل ہے لہذا کمزور طبقے کی گھٹی میں یہ بات پیوست ہو جاتی ہے اور اسے کبھی یہ خیال بھی نہیں آتا ہے کہ اس کو اس کے جفاکشی اور ایمانداری کا بھی ویسا ہی صلہ ملنا چاہئے لیکن جب انصاف کا احساس ابھرتا ہے تو ظلم کے خلاف بغاوت ہوتی ہے اور انقلاب آتا ہے اور پھر دوبارہ طبقوں کی درجہ بندی ہوتی ہے۔

ہندوستان میں آزادی کے بعد جو انقلاب آیا اس میں جو طبقے کی درجہ بندی ہوئی تو ہندوستانی مسلمان کمزور طبقے میں آگیا اور اس صورت حال میں چند مسلمان نادانی میں ہندوستانی مسلمانوں کو وہی سبق پڑھا رہے ہیں تاکہ ہندوستانی مسلمان ہریجنوں سے جو جگہ خالی ہو رہی ہے اس کو پورا کریں شاید آزادی کے قبل ایسی حالت نہ رہی ہو۔ بجائے اس کے کہ ہندوستانی مسلمان ہر اس فرد اور گروہ کا پوری قوت سے ساتھ دیں جو ہندوستان میں انصاف قائم کرنا چاہتا ہے اور عملی طور سے اس کا مظاہرہ بھی۔ اس راہ میں اگر مسلمان مارا بھی جاتا ہے تو وہ شہید ہوگا۔ اگر اس وقت کوئی ایسا گروہ موجود نہ ہو جیسا کہ مجھے نظر آرہا ہے تو انصاف قائم کرنے کے لئے گروہ بنانا چاہئے کیونکہ کرشن، رام بدھ اور گاندھی کے ملک میں ایسے افراد کی کمی نہ ہوگی اور مجھے پورا یقین ہے کہ ابھی یہاں انسانیت مری نہیں ہے۔ اگرچہ ملک اس طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے جو پورے ملک کو برباد کردے گا جس سے محض مسلمان ہی نہیں بلکہ دوسرے برادران وطن بھی برابر متاثر ہوں گے۔

آئندہ شمارے میں
اردو ناول کا گردآلود سفر۔ کے کے کھلر
چے خف کے پروپوزل کا ترجمہ۔ انوار رضوی

ب۔۱

کتابوں کی باتیں

کچھ نئی اور کچھ پرانی مطبوعات

کتاب۔ برگ غزل
شاعر۔ ابومحمد سحر
قیمت۔ 15 روپے
صفحات۔ 112 (مجلد مع گرد پوش)
کاغذ۔ سفید
ناشر۔ مکتبہ ادب، 39 مالویہ نگر بھوپال

ابومحمد سحر ہمارے ان معتبر ناقدین میں ہیں جو گروہی مفادات سے بلند ہیں اور سنجیدگی سے ادب کو اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ اردو میں قصیدہ نگاری، تنقید و تجزیہ اور مطالعہ امیر کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے وہ ابومحمد سحر کی تنقیدی بصیرت کے قائل ہیں۔ سحر صاحب کی زیر نظر کتاب غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اور یہ غزلیں خواہ مخواہ نہیں ہیں۔ ان غزلوں سے انسانی جذبات کا انعکاس، تہذیب اور تطہیر ہوتی ہے۔ خوبصورت غزلیں ہیں جو پڑھنے میں بھی مزہ دیتی ہیں اور گانے میں بھی۔ نادر و نایاب تجربات ہیں۔ کہیں بھی فرسودگی کا احساس نہیں ہوتا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہ تو نہیں کہ بادیہ پیما نہ آئے گا
اے دشت آرزو کوئی ہم سا نہ آئے گا
چلنا نصیب زیست ہے یونہی چلے چلو
اس راستے میں شہر تمنا نہ آئے گا
راہ وفا میں قطرۂ شبنم بھی ہے بہت
جس سے بجھے گی پیاس وہ دریا نہ آئے گا
خود ہو سکے تو اپنے اندھیرے اجال لو
اب کوئی صاحب ید بیضا نہ آئے گا
اے اہل دل خموش کہ یہ جائے صبر ہے
دکھ تو یونہی رہیں گے مسیحا نہ آئے گا
گا ہے وفور شوق نو گا ہے ہجوم یاس
سب کچھ تو آئے گا ہمیں جینا نہ آئے گا
بیٹھے رہیں سحر یونہی دیوار و در لیے
اپنا جسے کہیں کوئی ایسا نہ آئے گا

اس مجموعہ میں ۵۰ غزلیں ہیں اور ان میں سے کوئی غزل بورنگ نہیں ہے۔ یہ اس بات کی سفارش ہے کہ ہر شائق سخن کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

•••

کتاب۔ چھٹا بیٹا
مصنف۔ اپندر ناتھ اشک
پبلشر۔ نیا ادارہ۔ ۵ خسرو باغ روڈ الہ آباد ۲۱۱۰۰۱
قیمت۔ 15 روپے
نوعیت۔ ڈرامہ (ایک گھریلو طنز)
صفحات۔ 112 (مجلد مع گرد پوش)
کاغذ۔ عمدہ سفید

اردو میں ڈراموں کی روایت مضبوط نہیں ہے چند اچھے ڈرامے ہیں۔ اشک کا ڈرامہ چھٹا بیٹا ان اچھے ڈراموں میں اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ تین دہائی پہلے لکھا گیا تھا اور بمبئی سے مصنف کے مجموعہ ازلی راستے میں شائع ہوا تھا۔ ہندی میں یہ ڈرامہ بہت مقبول ہوا اور مختلف بڑے شہروں کے اسٹیج پر بار بار کھیلا گیا ہے

چھٹا بیٹا انسان کی ناآسودہ خواہشات کا سمبل ہے جو اس کی اپنی ذاتی کمزوریوں کے باعث پوری نہیں ہوتیں اور لاشعور کے تہ خانوں میں دفن رہتی ہیں جن کی تکمیل کے لیے انسان سپنے دیکھتا ہے لیکن چونکہ اپنی عادتوں کو یکسر بدل دینا اس کے لیے آسان نہیں ہوتا اس لیے اس کے خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوتے۔

یہ ڈرامہ انسانی نفسیات کا نہایت خوبصورت مطالعہ ہے اس میں فنی اعتبار سے وہ پختگی دکھائی دیتی ہے جو اس ڈرامے کو آوٹ آف ڈیٹ نہیں ہونے دیتی۔ اشک جی کو ڈرامے کے فن پر پورا عبور حاصل ہے۔ تکنیک ان کے ہاتھوں میں موم کی طرح ہے۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق اس تکنیک کو موڑ توڑ کر اپنا مقصد حاصل کرتے ہیں۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ اسے ضرور خریدا اور پڑھا جائے۔

•••

(تبصرہ کے لئے دو کاپیاں بھیجیے)

کتاب۔ شب چراغ
شاعر۔ حسن نجمی سکندر آبادی
پتہ: عصری آگہی پبلی کیشن رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲

ترقی پسندی اور ترقی پسندوں کا ساتھ یہ دو الگ چیزیں ہیں۔ ترقی پسندی اتنی خوش آئند ہے کہ سب کچھ کھونے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ لیکن ترقی پسند وہ تلخ تجربہ ہے۔ جو ایثار پسندوں کے ذہن کو جھٹکا پہنچاتا ہے۔ چنانچہ وہ حساس طبیعتیں جو جوشِ انسانیت میں زمانے کو بدلنے اور ہر قوت سے ٹکرانے کو تیار ہوتی ہیں اپنے آپ سے بہت جلد الجھنے لگتی ہیں۔

مقامِ عبرت ہے کہ روشن خیال ذہنوں میں کچھ ایسی تنگ دلی چھپی بیٹھی ہے جو نئے پودوں کو پنپنے سے پہلے ہی ضائع کر دیتی ہے۔ میں زیرِ نظر کتاب کے مصنف سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہوں لیکن کلام کے آئینے میں اس کی شخصیت کے پردے اٹھا اٹھا کر دیکھتا ہوں تو ستم آہو فریب کھائے ہوئے انسان کی جگہ خراشی صاف سنائی دیتی ہے۔ آیئے کچھ شعر پڑھیں۔ اور رہِ شستہ جنوں کی سفاکیوں کے جلو میں کچھ نہ دیدہ درد کی خلش کو محسوس کریں۔

نجمی یہ صدا دیتے ہوئے گزرے ہیں کچھ لوگ
جمعیتیں چھوٹی ہیں اور افراد بڑے ہیں
چہروں کا احتجاج کہ ہم ساتھ ساتھ ہیں
جسموں کی یہ تلاش کہ چہرے کدھر گئے
سرمایۂ ثواب کوئی اور لے گیا
لیکن عذاب وقت کا ڈھونا پڑا ہمیں
میرے نغموں میں نہاں ہے سوزِ احساس تو
میری آواز دل میں شبنم کی نمی مت ڈھونڈنا
جو ملے گا وہ فرشتہ ہوگا میرے شہر میں
میرے بعد آنا یہاں تو آدمی مت ڈھونڈنا

یہ تو وہ احتجاج ہے جو اہلِ قافلہ کی ستم ظریفیوں کا شکار ہو کر ایک خاموش کراہ میں تبدیل ہو گیا ہے۔

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

اب تو گلشن میں رہے سبز قباؤں کا سفر
بڑا سفاک ہے یہ زرد ہواؤں کا سفر
دھندلے دھندلے سے مناظر ہیں نظر کی حد میں
یہ اجالوں کا سفر ہے کہ گھٹاؤں کا سفر
مجھے لے جائے گا کس منزل نو میں آخر
جو تھے احساس کی انجانی دشاؤں کا سفر
چاہتا ہوں کبھی یوں بھی تو بکھر جاؤں میں
جیسے جاری ہے خلاؤں میں شعاعوں کا سفر
پیاسی دھرتی کو تو دو بوند بھی پانی نہ ملا
اب کے ساون میں تھا کیا خشک گھٹاؤں کا سفر
جانے کس دھرتی کی خوراک بنے گا انور
ذہن تھک جائے گا جب کرکے خلاؤں کا سفر

انور مینائی

غزلیں

ضیا فتح آبادی

اعتبار اٹھتے ہی عالم معتبر ہو جائے گا
جب خبر آئے گی، انساں بیخبر ہو جائے گا
شمع ہو جائے گی ہی آگ میں جل کر خموش
قصۂ طولِ شبِ غم مختصر ہو جائے گا
منزلِ مقصود کو پائے گا زیرِ نقشِ پا
وہ مسافر جو بھٹک کر راہ بر ہو جائے گا
مستقل غم دل نے چاہا تھا مگر تھی کیا خبر
درد بڑھ کر آپ اپنا چارہ گر ہو جائے گا
میرے تیرے درمیاں اک لمحہ کا ہے فاصلہ
جو مرا ہے آج وہ کل تیرا گھر ہو جائے گا
ٹھوکریں کھانے پہ بھی میں اس لیے گرتا نہیں
کون جانے میرا "میں" کیا ٹوٹ کر ہو جائے گا
کیا کہوں خوابِ طلسمِ شب کی کیفیت ضیا
آنکھ جب کھل جائے گی وقت سحر ہو جائیگا

پردۂ رُخ اٹھا دیا، تابِ نظر نہ جائے کیوں
آنکھ خرابِ دید کی اشکوں سے بھر نہ جائے کیوں
فصلِ بہار جا چکی، پھولوں میں رنگ و بو نہیں
نشہ جو تھا چڑھا ہوا سر سے اتر نہ جائے کیوں
آہ، یہ تیرگی شب، اُف، یہ سکوتِ مستقل
دل میرا ہیبت آشنا سائے سے ڈر نہ جائے کیوں
حسن و شباب کی قسم، جام و شراب ہیں مبہم
گردشِ مہر و ماہ بھی آج ٹھہر نہ جائے کیوں
نامہ بروں کو کیا ہوا، بیٹھے ہیں پر شکستہ سے
تیری خبر نہ آئے کیوں، میری طرف نہ جائے کیوں
وقت کا سیل دم بدم شام و سحر رواں دواں
وقت گزر ہی جائے گا۔ وقت گزر نہ جائے کیوں
بزمِ حیات کی یہی رسم قدیم ہے ضیا
سر بسر جو آئے وہ خاک بسر نہ جائے کیوں

زخمِ وفا

شعور و فکر ہیں آماجگاہ کرب و ہراس
دیارِ ذہن و عمل میں ہے شور و شر برپا
بکھر چکا ہے سکون و اماں کا شیرازہ
بھڑک اٹھی ہے تشدد کی آگ ہر جانب
ہر ایک شہر میں وحشت کا دور دورہ ہے
تمام ملک میں اک انتشار برپا ہے
درندگی کا ہر اک سمت بول بالا ہے
لہو لہان سا انسانیت کا چہرا ہے
زوالِ فکر و نظر کے اشارے ہر سو ہیں
فساد و قتل کے خونیں نظارے ہر سو ہیں
شکم پری کے لیے آدمی ہراساں ہے
ہوئی ہے عام وطن میں کساد بازاری
تجوریوں میں چھپائے گئے ہیں کالے دھن
ہر ایک فرد کو عادت ہے کام چوری کی
یہ سارے جرم تو سنگین جرم ہیں لیکن
کچھ اپنے ملک کے رہبر بھی اسمیں شامل ہیں
بہت سے خود غرض افسر بھی اسمیں شامل ہیں
سفید پوش درندے بھی اسمیں شامل ہیں
فریب کار فرشتے بھی اسمیں شامل ہیں
یہ سارے لوگ ہی جمہوریت کے دشمن ہیں
یہ سارے لوگ ہی انسانیت کے دشمن ہیں
یہ دیش ماتا کی وحدانیت کے دشمن ہیں
یہ خون پیتے ہیں اس دیش کے غریبوں کا
یہ خون کرتے ہیں اس دیش کے اصولوں کا
گلاب سرخ کی بیٹی! ادھر بھی ایک نظر
گرفت سخت ہو ذرا سیاہ کاری پر
تجوریوں سے نکالے تو جائیں کالے دھن
ذخیرے بند نہ ہوں سیٹھوں کے گوداموں میں
وطن فروش سزاؤں کے مستحق ٹھہریں
ریا پسند نظر آئیں پھر پسِ زنداں
نئی فضا، نئے ماحول کا تقاضا ہے
کہ ہند میں بڑھے محنت کی قدر افزائی
حیات امن کی وادی میں پھر خراماں ہو
دیارِ فکر و عمل پھر بہار ساماں ہو
نہ خون اب ہو یہاں دیش کے اصولوں کا
رواں ہو قافلہ جمہور کے رسولوں کا

ظہیر غازیپوری

یادِ رفتہ

وقتِ رفتہ دور دھندلی وادی سے پکار کر
لے گیا ہے اک حسین جہان میں
شاعرِ غمزدہ کے دل میں اور تصورات میں
کچھ حسین لمحوں کی جھلکیاں سی آئی ہیں
کچھ سہانے رنگوں کی بدلیاں سی آئی ہیں
سرد سرد دلفریب و جانفزا
گرم گرم دلنشیں و دل ربا
سحر آفریں فضا
شام کے دھندلکوں میں وقت ہے رُکا رُکا
جیسے میکدہ کی شام، جیسے فردوسی فضا
قہقہوں کی گونج میں
رنگا رنگ بلوریں جام
اٹھتے ہیں، چھلکتے ہیں، کھنکتے ہیں
دلنشیں سے جھرمٹوں میں حسن محوِ رقص ہے
دلفریب ساز پر عشق ہے نغمہ زن
خود کلام و شادماں۔
جامِ ارغواں بدستِ حسن ہے نظارہ سوز
عشقِ تشنہ کام کے
حوصلوں و ولولوں کو دے رہا ہے دعوتیں
عشقِ دل گرفتہ کو مل گئیں آزادیاں۔
آزادیاں، بربادیاں
فنا فنا سی آرزو
چھپی سی حسرتیں
مل گئے ہیں سوز و ساز
فضا دھواں دھواں ہوئی
مچل مچل کے ساز و رقص،
پگھل پگھل کے حسن و عشق
بن گئے ہیں ایک راز۔
لے اڑا ہے بے رحم وقت سب نشانیاں
شاعرِ خستہ جاں کے دل میں اور تخیلات میں
کچھ سہانے رنگوں کی بدلیاں سی آئی ہیں

انیس جلالی

اشاعتی دنیا میں
ایک معتبر نام

تاج کمپنی

- تاج کمپنی کی مطبوعات معیاری اور مثالی ہوتی ہیں۔
- تاج کمپنی جدید طباعتی طریقوں کے ذریعے فوٹو آفسٹ پروسس سے کتابیں شائع کرتی ہے۔
- تاج کمپنی کے شائع کردہ قرآن مجید اور حمائل شریف بے حد دیدہ زیب طباعتی خوبیوں سے مزین، سفید دبیز کاغذ پر دستیاب ہیں۔
- تاج کمپنی نے اسلام اور اسلامیات سے متعلق معروف مصنفین کی معلوماتی کتب کے انگریزی اور اُردو میں مجلد ایڈیشن شائع کئے ہیں۔
- تاج کمپنی کا ایک وسیع اشاعتی پروگرام ہے جس کے ذریعے معتبر و مستند اسلامی لٹریچر، بہترین طباعت و اشاعت کے ساتھ انگریزی اور اُردو میں پیش کیا جائے گا۔
- تاج کمپنی کی مطبوعات یقیناً آپ کی زندگی کی اہم ساتھی ہوں گی۔

تاج کمپنی کی کتابیں مطالعے کے لئے معیاری اور تحفے کے لئے مثالی رہیں گی
مستند مواد، معیاری طباعت، مناسب نرخ، یہ ہے تاج کمپنی کی انفرادیت!

اب تک شائع ہونے والی مطبوعات درج ذیل ہیں:

۱۔ قرآن مجید، نمبر ۲۲ ترجمہ: علّامہ احمد رضا خاں صاحب بریلوی، تفسیر: مولوی محمد نعیم الدین — ہدیہ -/۱۲۵ روپے
۲۔ قرآن مجید (عربی۔ اردو۔ انگریزی) انگریزی ترجمہ: مرماڈیوک پکتھال، اُردو ترجمہ: مولانا فتح محمد جالندھری — ہدیہ -/۶۰ روپے
۳۔ قرآن مجید، دی گلوریس قرآن (عربی متن اور انگریزی ترجمہ): مرماڈیوک پکتھال۔ — ہدیہ -/۲۸ روپے
۴۔ تاج بہشتی زیور، کامل اصلی ——— مولانا اشرف علی تھانوی — ہدیہ -/۶۰ روپے
۵۔ مجموعۂ وظائف مترجم ——— (دو رنگوں میں) — ہدیہ -/۱۵ روپے
۶۔ بائبل، قرآن اور سائنس ——— موریس بوکائلے ——— (پیپر بیک) — قیمت -/۲۵ روپے
۷۔ بائبل، قرآن اور سائنس ——— موریس بوکائلے ——— (مجلّد) — قیمت -/۳۰ روپے
۸۔ نوائے مشرق ——— علّامہ اقبال اور مولانا مودودی کا ایک تقابلی مطالعہ: سعید احمد — قیمت -/۳۰ روپے
۹۔ فیروز اللغات ——— اُردو جیبی ——— (طلبا کے لئے) — قیمت -/۱۲ روپے
۱۰۔ فیروز اللغات ——— اُردو ——— (بڑے عام سائز میں) — قیمت -/۲۵ روپے

- THE QURAN READER by S. Muhammad Tufail 17.00
- ALLAH OUR CREATOR by Mohd Zia Ullah 13.00
- CREATION OF A MAN by Kamal Nasir 12.00
- CORRESPONDENCE BETWEEN MAULANA MAUDOODY & MARYAM JAMEELAH 12.00
- MIRACLES OF THE PROPHET MUHAMMAD by M. A. Qazi 11.00
- MORALITY by Dr. M. Muslehuddin 13.00
- PROPHET MUHAMMAD'S GUIDANCE FOR CHILDREN by Abdur Rauf P.B. 12.00 H.B. 15.00
- WESTERNIZATION AND HUMAN WELFARE by Maryam Jameelah 12.00
- THE TAWASIN by Husain Bin Mansur 10.00
- DUTIES OF AN IMAM by A. R. Shad 8.00
- ISLAM AND THEOCRACY by M. M. Siddiqi 8.00
- THE SUNNAH by Dr. S. M. Yusuf 8.00
- WESTERNIZATION VERSUS MUSLIMS by Maryam Jameelah 7.00
- ISLAM AND THE MUSLIM WOMAN TODAY by Maryam Jameelah 5.00
- MODERN TECHNOLOGY AND THE DEHUMANIZATION OF MAN by Maryam Jameelah 4.00
- THE MYSTERIES OF FASTING by Nabih Amin Faris 7.00
- IS WESTERN CIVILIZATION UNIVERSAL by Maryam Jameelah 4.00
- THREE GREAT ISLAMIC MOVEMENTS IN THE ARAB WORLD OF THE RECENT PAST by Maryam Jameelah 4.00
- THE KASHF AL MAHJUB by Ali Bin Usman, Tr. By R. A. Nicholson 65.00
- THE HOLY QURAN (Arabic text with English and Urdu translation) by M. M. Pickthall and Maulana Fateh Mohd. Jullundhri 60.00
- DAWAT UL QURAN by Dr. Fazluddin Ajmeri 64.00
- ISLAM VERSUS AHL AL KITAB by Maryam Jameelah 40.00
- ISLAM & THE REMAKING OF HUMANITY by A. M. Siddiqi 45.00
- ISLAM THE IDEAL RELIGION by Prof. S. Y. El-Digwy 40.00
- MUSLIM ETIQUETTES by A. R. Shad 40.00
- UMM AL MUMININ AISHAH SIDDIQAH by Mushtaq Musa 40.00
- PATH TO PARADISE by Mohd. Jerris 35.00
- THE MISSION OF ISLAM by S. M. Iqbal P.B. 25.00 H.B. 30.00
- NAWA-E-MASHRIQ (URDU) by Saeed Ahmad 30.00
- THE MEANING OF THE GLORIOUS QURAN by M. M. Pickthall 28.00
- WIVES OF THE PROPHET by Fida Husain Malik 25.00
- ISLAM, CHRISTIANITY AND HINDUISM by F. M. Sandeela 25.00
- WOMAN IN ISLAM by S. A. Saif Al-Harony 20.00
- THUS SPOKE THE HOLY PROPHET by Bennett and Browne 20.00
- BAHISHTI ZEVAR (Urdu) by Maulana Ashraf Ali Thanvi 60.00
- QURAN FOR CHILDREN by Abdur Rauf P.B. 11.00 H.B. 17.00
- TWO MUJAHIDIN OF THE RECENT PAST AND THEIR STRUGGLE FOR FREEDOM AGAINST FOREIGN RULE by Maryam Jameelah 4.00
- A GREAT ISLAMIC MOVEMENT IN TURKY by Maryam Jameelah 3.00
- ISLAM AND OUR SOCIAL HABITS by Maryam Jameelah 3.00
- ISLAM AND MODERN MAN by Maryam Jameelah 3.00
- ISLAMIC CULTURE IN THEORY AND PRACTICE by Maryam Jameelah 3.00
- RATIONAL APPROACH TO RELIGION by Zakiuddin Kirmani 3.00
- SHAIKH HASAN AL BANNA & AL IKHWAN AL MUSLIMUN by Maryam Jameelah 3.00
- THE GENERATION GAP by Maryam Jameelah 2.00
- WHY I EMBRACED ISLAM by Maryam Jameelah 1.00

تاج کمپنی کی مطبوعات ہندوستان بھر میں تمام اہم بک سیلرز سے مل سکتی ہیں۔
تاجرانہ رابطے کے لیے: **تاج کمپنی، ۳۱۵۰ ترکمان گیٹ۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶**
ڈسٹری بیوٹر برائے ... : اسلامک بک ٹرسٹ ۱۳۹۰ بازار مٹیا محل، دہلی ۶

CHINGARI (Fortnightly) 1410/3 Ram Nagar Shahdara Delhi-32
R. N. 36930 80 Regd. No. D (E) 49 Price Rs. 2-00

۵۰ روپے کی خصوصی رعایت

★ پندرہ روزہ چنگاری ایک ایسا رسالہ ہے جسے خاص و عام دونوں حلقوں میں مقبولیت حاصل ہے۔ اس کے ایک شمارہ کی قیمت ۲ روپے اور زرِ سالانہ ۴۵ روپے ہے۔

★ راجندر سنگھ بیدی نمبر کی قیمت ۶۵ روپے ہے۔

★ سعادت حسن منٹو (ایک نفسیاتی تجزیہ) کی قیمت ۳۰ روپے ہے۔

★ لوکاچ اور مارکسی تنقید مصنفہ اصغر علی انجینئر، کی قیمت ۳۰ روپے ہے۔

چنگاری، منٹو، بیدی اور لوکاچ کی مجموعی قیمت ۱۷۰ روپے ہوتی ہے۔ اگر آپ ہمیں ۱۲۰ روپے ارسال کردیں تو بیدی نمبر، منٹو اور لوکاچ آپ کو بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک بھیج دیا جائے گا اور ایک سال کے لیے چنگاری آپ کے نام جاری کردیا جائے گا۔

اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ

★ اگر آپ پندرہ روزہ چنگاری یا ماہنامہ عصری آگہی کے سالانہ خریدار ہیں تو آپ کو ہر کتاب کی خریداری پر پندرہ سے بیس فیصد کمیشن دیا جائے گا چاہے آپ ہمارے ادارے کی کتاب خریدیں یا ہمارے توسط سے کسی دوسرے ادارے کی کتاب۔

پتہ

عصری آگہی پبلی کیشنز، ۱۴۱۰/۳ - رام نگر، شاہدرہ دہلی ۳۲